

سانپ کے منہ میں چھپکلی

اس نے لندن ہی سے فون کر کے رضوی صاحب کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اچانک ہی یہاں آ گیا ہے اور ان سے ششما کے لئے ہدایات طلب کی تھیں۔

رضوی صاحب نے اس ”خوشگوار سر پرانز“ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فی الوقت ششما سے صرف ملاقات کرنے پر اکتفا کی ہدایت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وقت کی کمی کا بہانہ کر کے وہ جلدی جان چھڑا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بات اس کی صوابدید پر چھوڑ دی تھی کہ اگر وہ پسند کرتا تو فی الوقت اس سے نہ ملے۔

”نہیں جناب۔ اب میں آیا ہوں تو ملاقات نہ کرنا زیادتی ہوگی۔“ اس نے فون پر ہی ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”او کے گڈ لک۔ جس روز واپسی کا پروگرام ہو، اطلاع کر دینا۔ کوئی دوست تمہیں ایئر پورٹ پر ریسیو کر لے گا۔“

”تھینک یوسر!“

اس نے کیرن سے تین چار روز بعد ایک دن اکیلے گھومنے کی اجازت لے لی تھی۔ اس طرح وہ خود یہاں کے اسرار و رموز سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔

ارسلان اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نوجوان کی آمد اچانک نہیں بلکہ طے شدہ ہے کیونکہ اس درمیان مختلف بہانوں سے ششما نے چار پانچ مرتبہ مختلف جگہ فون کئے تھے۔
اس نے اس درمیان کئی جگہ اپنی اور ارسلان کی اکٹھے تصویریں بھی اتاری تھیں۔
ارسلان اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ تصویریں کیوں اتاری جا رہی ہیں؟
یقیناً یہ ریکارڈ میں جمع ہونی تھیں۔

شام تک ششما سے اپنی دانست میں پاکستان سے متنفر کر چکی تھی اور اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اب یہ ”پٹھا“ ان کے گھناؤنے مقاصد کی بجا آوری میں ان کا معاون ثابت ہوگا۔
اس نے ارسلان کے ناں ناں کرتے بھی لندن کے بہت بڑے ستور سے اس کے لئے اچھی خاصی شاپنگ کر لی تھی۔

ایک طویل بوسے اور جلد ملاقات کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد اس نے آٹھ بجے شام اسے پکاڈلی انٹیشن پر ڈراپ کر دیا تھا۔ وہ ایئر پورٹ پر رخصت کرنے کی شدید خواہش مند تھی۔ ارسلان نے اسے اپنی فلائٹ کی روانگی سے آگاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔
کیونکہ اس کی منتظر تھی.....!

ایک مرتبہ پھر وہ کیرن کی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دونوں سیدھے لیوٹن آئے تھے۔ باقی وقت انہوں نے اکٹھے گزارا۔ کیرن نے اسے رات کا کھانا گھر سے باہر کھانے کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے کیرن کی صحبت سے لطف اندوز ہونا زیادہ ضروری سمجھا۔

اگلا سارا دن اس نے پھر کیرن کے ساتھ آوارہ گردی کی نذر کر دیا۔ نجمہ ملک نے اسے بتایا تھا کہ دوسری مرتبہ مختاراں بائی اس کے لئے بندہ بھیج چکی ہے اور دو تین فون بھی اس نے کئے ہیں۔
اس نے ارسلان کو بتایا تھا کہ اب وہ واپس آ کر ذرا اسے سنبھالے۔ کہیں وہ کنٹرول سے باہر ہو کر کوئی غلط قدم نہ اٹھالے۔

یوں بھی وہ ملک کے اعتماد کو مجروح کر کے اپنے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔
دوسرے دن رات کی فلائٹ سے وہ پاکستان واپس جا رہا تھا۔

کیرن سے اس نے لیوٹن میں ہی علیحدگی اختیار کر لی تھی اور ایئر پورٹ تک مسٹر مارٹن اسے چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے مسٹر مارٹن کو باہر ہی سے رخصت کر دیا تھا اور سیدھا ٹریٹل پر چلا گیا

کیرن نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا اور اسے لندن کا نقشہ تھماتے ہوئے شام آٹھ بجے پکاڈلی انٹیشن پر اس جگہ پہنچنے کے لئے کہا تھا جہاں اس نے ارسلان کو چھوڑا تھا۔
کیرن سے الگ ہوتے ہی اس نے فون باکس سے ششما کے نمبر گھمانے شروع کر دیئے۔ دوسرے نمبر پر وہ مل گئی۔ ارسلان کی اس طرح اچانک آمد نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔
”کہاں سے بول رہے ہو؟“

جواب میں ارسلان نے وہ جگہ بتائی اور قریباً آدھ گھنٹہ بعد ششما بھٹے چار یہ وہاں موجود تھی۔

”ویل کم!“ اس نے ارسلان کے گلے کا ہار بننے ہوئے کہا۔
اپنی کار میں وہ ارسلان کو نزدیک ہی ایک ریسٹورنٹ کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھی۔
راستے میں ارسلان نے اسے اچانک اطلاع دینے پر معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسے اچانک ملک صاحب کے خاص کام سے یہاں پانچ روز کے لئے آنا پڑا اور وہ پرسوں ہی واپس جا رہا ہے لیکن بہت جلدی واپس آئے گا۔ پھر اس سے تفصیلی مذاکرات ہوں گے۔
اس اچانک اور انتہائی مختصر شیڈول پر ششما نے زبردست احتجاج کیا لیکن کسی نہ کسی طرح ارسلان نے اسے مطمئن کر لیا۔ ششما نے وہیں سے فون کر کے کسی کو اپنے شام تک لوٹنے کی اطلاع دی تھی اور کہا تھا کہ ایک دوست پاکستان سے اچانک اور انتہائی مختصر ملاقات کے لئے آیا ہے۔

شام تک کا وقت انہوں نے اکٹھے گزارا۔
اس دوران وہ مختلف جگہ گھومتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ششما بھٹے چار یہ نے اس درمیان اپنی دانست میں رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ارسلان سے اپنی ایشیائی نوجوان تنظیم کا فارم رکیت بھروایا۔ پھر اسے پاکستان میں دفتر کھولنے کی ہدایت کی۔

ایک جگہ وہ دوپہر کے بعد جب کھانا کھا رہے تھے تو اچانک ششما کا ایک واقف کاران سے ٹکرا گیا۔ ششما نے اس کا تعارف کر پلائی کے نام سے ارسلان سے کروایا اور اسے اپنی تنظیم کا وائس پریذیڈنٹ بتایا تھا۔

تمہیں ایک تجربے سے گزارنا چاہتی تھی۔ میں تم پر ثابت کرنا چاہتی تھی کہ اگر انسان پر اعتماد ہو تو کمپیوٹر بھی اندھا ہو جاتا ہے۔ چونکہ تمہارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ تم کوئی مشتبہ شے اپنے ہمراہ لے جا رہے ہو۔ سو تم پر اعتماد اور مطمئن تھے لیکن پہلے ہی چکر پر اگر تم گھبرا جاتے تو ضرور کوئی ایسی ایسی سیدھی حرکت کر دیتے جس سے تم مشتبہ ٹھہرتے اور پکڑے جاتے۔ اب ایک کامیاب چکر لگانے کے بعد تم باخبر ہو کر بھی جاؤ گے تو اعتماد سے جاؤ گے۔“

وہ اچانک ہی موڑ کاٹتے ہوئے اس کی طرف جھک کر مسکرائی اور ارسلان نے گدھوں کی طرح دانت نکال کر اس کی فلسفیانہ موٹا گانوں پر صا د کیا۔

”ملک صاحب کا کیا حال ہے؟“ اس نے موضوع بدلنا چاہا۔

”وہی ہمیشہ والا۔ بدست گھوڑے کی طرح ہوا کے زور پر اڑ رہا ہے۔ آج کل دارالحکومت کے چکر کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ انتخابات کے لئے جوڑ توڑ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اپنا پریشر گروپ مضبوط کر رہا ہے..... بے چارہ ملک!“

اس نے طنزیہ لہجے میں مسکراتے ہوئے ارسلان کی طرف دیکھا اور ارسلان کو جواب میں وہی حرکت دہرائی۔

”میری لندن روانگی کا تو انہیں علم ہو گا ہی.....؟“

”ہاں کیوں نہیں بہت خوش ہے وہ کہ بٹھا یورپ کی سیر کر رہا ہے۔ اس کا جال تم پر مزید مضبوط ہو رہا ہے۔ ہاں ایک چکر اس طوائف کے کوٹھے کا بھی لگا لیتا۔ تمہاری جدائی نے بے چاری کو خاصا پریشان کر رکھا ہے اور اسے سمجھا دینا کہ تمہارے بعد یہاں کوئی فون نہ کیا کرے۔ اس کی لگائیں ابھی سے کھینچ دینا“ اس سے پہلے کہ گھوڑی بے قابو ہو جائے.....!“ نجمہ ملک نے چیپ کوٹھی کے برآمدے کے سامنے پارک کرتے ہوئے کہا۔

دونوں اکٹھے ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔

مؤدب ملازم ان کے تعاقب میں ارسلان کا سامان اٹھائے چلا آ رہا تھا جو وہ لندن سے مہرے ہوئے ایچی کیس اپنے ہمراہ لایا تھا۔

ڈرائنگ روم کے آرام دہ صوفے میں دھنستے ہوئے اس نے نجمہ بیگم کی خواہش پر تمام واقعات بلا کم و کاست بیان کر دیئے تھے۔ ششما کا ذکر وہ گول کر گیا۔ یوں بھی یہ نجمہ بیگم کی پسند کا

جہاں ششما بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

جہاز میں چیک ان کرنے تک وہ اس سے چپکی رہی۔ پھر خاصے جذباتی انداز میں اس نے ارسلان کو رخصت کیا۔

پاکستان میں ایئر پورٹ پر رضوی صاحب کا ایک بندہ پہلے سے اس کا منتظر تھا۔ اس نے جہاز سے ہی اسے ”ریسیو“ کر لیا اور جیسے ہی اس کا سامان بیلٹ پر آیا، میزبان دوست اسے باہر لے آیا۔ صرف اس کے پاسپورٹ پر اندراج ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کسی کاؤنٹر پر کسی نے اس سے کچھ دریافت کرنے کی جرات نہیں کی تھی۔

○

ایئر پورٹ کے باہر نجمہ بیگم اس کی منتظر تھی۔

وہ خود جیب ڈرائیو کرتی یہاں تک آئی تھی۔ بڑی گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ارسلان کو خوش آمدید کہا تھا۔ واپسی پر بھی جیب وہ خود ہی چلا رہی تھی۔

”کیسا ہارپ؟“ اس نے نکٹھیوں سے ارسلان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بہت اچھا“ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ نے مجھے اعتماد میں لینا کیوں ضروری نہیں سمجھا۔ اس طرح بے خبری میں تو کچھ بھی ہو سکتا تھا.....“ اس نے دبی زبان میں گلہ کرتے ہوئے اپنے جذبات کے اظہار کی تلاش کی.....!

”ارسلان! اگر میں یہ کہوں کہ تم ابھی بچے ہو تو برا مت ماننا۔ گو کہ میری اور تمہاری عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے لیکن تجربے کی بنیاد پر میں کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہاری بزرگ ہوں۔ میں نے زندگی سے جو کچھ حاصل کیا اس کے لئے مجھے بہت کچھ قربان کرنا پڑا اور اس قربانی کے عوض جو تجربات مجھ تک منتقل ہوئے ہیں وہ سب بہت ایمانداری سے تم تک منتقل کر رہی ہوں کیونکہ ہم بزنس پارٹنر ہیں اور کبھی کبھی یہ بزنس کی پارٹنرشپ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ لائف پارٹنرشپ اس کے سامنے سچ دکھائی دیتی ہے..... تمہارے سوال کا مختصر جواب تو یہی ہے کہ اگر میں تمہیں باخبر کر دیتی تو اور کچھ ہو جاتا تو بھی تمہارا رد عمل کچھ بہتر نہ ہوتا اور اگر بے خبری میں کچھ ہوتا تو بھی تمہارا رد عمل مختلف نہ ہوتا۔ ایک بات تو طے شدہ ہے کہ تم مجھے کبھی انکار نہ کرتے۔ اس کا خدا نخواستہ یہ مطلب نہیں کہ ایسا تم کسی دباؤ کے تحت کر رہے ہو بلکہ آپس کے اعتماد کی بات ہے۔ دراصل میں

شکایتوں کا پتارہ کھول دیا۔

”بی بی بس چپ ہی بھلی..... جس پر گزرے وہی جانتا ہے بی بی.....!“ ارسلان نے نازنین کے پلنگ پر بیٹھے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی۔

بی بی کو سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ ارسلان باؤ نے کیا کہہ دیا؟ اس سے پہلے کہ وہ وضاحت طلب کرتی ارسلان کی طرف سے نازنین کے احوال دریافت کرنے پر وہ پھر پھٹ پڑی۔

”ارسلان باؤ! تمہیں کیا پروا اس بے چاری کی۔ بس یہ سمجھو کہ مرتے مرتے بچی ہے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ ڈاکٹر کام کامل گیا۔ اس نے تمہاری اچانک گمشدگی کو اپنی جان کا روگ بنا رکھا ہے..... میاں! تین دن سے اس حالت میں لیٹی ہے اور کٹھا بند ہے۔ کچھ خبر بھی ہے تمہیں.....؟“ اس نے ارسلان پر احساس کا بو جھڈا لٹا چاہا۔

اس اثناء میں نازنین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چہرے سے واقعی بیمار ظاہر ہو رہی تھی اور ارسلان دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ جو خبر مختاراں کو سنانے جا رہا ہے اس کے بعد تو واقعی ماں بیٹی کا یہی حال ہونے والا تھا جس کی وہ اکیٹنگ کر رہی تھیں۔

”شکر ہے خدا کا میری بچی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو آئی۔“ اس نے نازنین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ذرا چائے پانی کا بندوبست تو کر لوں۔“

یہ کہہ کر ہوشیار نائیکہ باہر آ گئی۔ اب وہ اپنی ہونہار صاحبزادی کو خنجر آزمائی کے لئے اکیلے چھوڑ آئی تھی اور ماں کے جاتے ہی بیٹی نے پر پرے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ اس نے حسب تربیت ناز و داد اسے ارسلان کو برا بھینٹہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر خنجرے دکھانے اور اٹھانے شروع کر دیے لیکن آج تو وہ پریشان ہی ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ ارسلان ابھی تک ”نارمل“ ہی ہے..... یہ اس کے لئے چونکا دینے والی بات تھی۔

اس سے پہلے کہ صورت حال کی سمجھ اسے آتی۔ مختاراں بائی نے گلاسوں میں بوتلیں اغیل کر برف کی ڈلیوں سمیت اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس نے نازنین کو آنکھ کے اشارے سے باہر جانے کی تلقین کی تھی کہ باؤ ارسلان سے بزنس کی بات کر سکے۔ اسے یقین تھا کہ اتنے عرصے میں ہی اس کی بیٹی نے باؤ ارسلان کو آٹے وال کا بھاتا دیا ہوگا۔

”ارسلان بیٹا! تم نے کچھ ہی کر دی۔ ایک تو میں نے اپنی خاندانی روایات کا ستیاناس

مضمون نہیں تھا۔

جیسے جیسے وہ آپ بیتی سن رہا تھا، نجمہ بیگم کی آنکھوں کی چمک بڑھ رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے والے صوفے میں دھنسی سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے فضا میں کھیر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ اب مقامی سیاست سے آہستہ آہستہ کنارہ کشی کرو اور ”انٹرنیشنل پالیٹکس“ کی طرف توجہ بڑھاؤ۔“ اس نے انٹرنیشنل پالیٹکس کے الفاظ کہتے ہوئے ارسلان کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھ بھی دبا دی تھی۔

ارسلان حسب سابق مسکرا کر رہ گیا۔

مختاراں کو جب استاد جی نے باؤ ارسلان کی آمد کی خبر دی تو اس کے نحوست زدہ چہرے پر سرخیاں ناچنے لگیں..... گزشتہ ایک ہفتے سے وہ ہر روز کسی نئی ذلت کا سامنا کر رہی تھی۔ وہ کوٹھا جس پر رونقیں عاشق تھیں آج کسی اجاڑ خانقاہ کا منظر پیش کر رہا تھا جس کی مختاراں بائی مجاور بن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ابھی تک براہ راست ملک صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی جرأت نہیں کی تھی اور ارسلان کی شدت سے منتظر تھی کیونکہ ارسلان کی طرف سے ایڈوانس کے بعد سے اسے ایک پھوٹی کوڑی بھی ابھی تک نہیں ملی تھی۔

استاد جی کے منہ سے باؤ ارسلان کا نام سن کر بستر سے کہنی کے بل لیٹی نازنین نے اچانک اسی طرح اٹھ کر استاد کی طرف دیکھا جیسے پلنگ میں لگے کسی سپرنگ نے اسے فضا میں اچھال دیا ہو۔

”ذرا سنبھل کے۔“ ہوشیار نائیکہ نے اپنے ”مستقبل“ کو آنکھ کے اشارے سے سمجھایا۔

دوسرے ہی لمحے وہ پلنگ پر اس طرح دراز ہو گئی جیسے صدیوں کی بیمار لیٹی ہو اور ارسلان کے کمرے میں داخل ہونے تک اسی پوزیشن میں لیٹی رہی۔

”واہ باؤ! ارسلان! تو نے ہمارے ساتھ اچھی نبھائی۔ چپ چاپ کام کروا کے کھسک گئے۔ ہماری خبر تک نہ لی۔ نہ جاتے ہوئے بتایا.....“ مختاراں نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی

اپنے دلی جذبات کا معمولی عکس بھی چہرے پر باقی رہنے دیا ہو۔

”ارسلان باؤ! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہم نے تو تمہیں ہمیشہ اپنا بچہ سمجھا ہے۔ تم جانتے ہو میں نے بھی نازنین کو تنہائی میں کسی تماش بین کے نزدیک نہیں پھکنے دیا اور تم.....“

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اب ارسلان کو اپنے احساسات کا احساس دلانا چاہا تھا۔

”خیر۔ میری بات سنو اور زیادہ جذباتی بننے کی کوشش نہ کرو۔ بی بی! یہ کام میں نے

تیسری پارٹی کے کہنے پر کیا تھا ورنہ میرا دماغ تو خراب نہیں تھا کہ اتنا خطرناک کام اور وہ بھی ملک

صاحب کے خلاف کرواتا۔ وہ تو میری ہڈیوں سے کھال اتار کر کتوں کے سامنے ڈلواسکتا ہے۔

اچھی خاصی رقم کی امید تھی لیکن جب میں نے ان لوگوں سے بقیہ کا تقاضا کیا تو وہ حرام خور الٹا مجھے

نی دھمکیاں دینے لگے۔ بی بی یہ سیاست دان لوگ تو ہمارے بھی ”گرو“ نکلے۔ مجھے انہوں نے

گالیاں دیتے ہوئے گھر سے نکال دیا اور دھمکی بھی دی کہ اگر آئندہ کبھی اس مسئلے پر بات بھی کی تو

میرا اور تمہارا وہ حشر کروائیں گے کہ ایک زمانہ عبرت حاصل کرے گا۔ میں تو چکر اکر رہ گیا۔ ایک تو

اپنے مالک سے احسان فراموشی کی اور دوسری طرف سے جو تے بھی پڑے۔ بی بی! ہماری قسمت

یہی بری ہے۔ بس صبر شکر کرلو۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ تھانے کچہری کا کام کروادیا کریں گے لیکن

اگر بھولے سے بھی اس بات کا تذکرہ کسی سے کر دیا تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

مختار اں بائی کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ بمشکل اس نے سیون اپ کے دو گھونٹ حلق میں

انڈیل کر اپنی حالت سنبھالی۔

”بیٹا! تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم کہیں.....؟“

”بی بی! قسم لے لو اگر میں جھوٹ بولوں۔ میں خود بری طرح پھنس گیا ہوں۔ ان

سالوں نے ہمیں دھوکے میں رکھ کر استعمال کیا ہے۔ اب اگر ہم میں سے کسی نے ان کے سامنے

چوں چراں کی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ اپنے اس احسان کے

بدلے ان سے تھانے کچہری کا کام کروالیا کریں۔ اس طرح شاید ہمارا نقصان پورا ہو جائے۔“

یہاں ہر دوسرے گھر پر ایک دو مقدمے بنے ہوئے ہیں باقی تمہاری مرضی۔ ہاں یہ رکھ لو۔ قسم کھا کر

کہتا ہوں کہ اپنے پاس سے دے رہا ہوں۔ یہ تو میرا مولا ہی جانتا ہے کہ میں نے کتنے گھانٹے کا

کرتے ہوئے اس بوڑھے بھیزے کے سامنے اپنی پھول سی بچی کو صرف تمہارے کہنے پر پھینک

دیا اور دوسرے تم اچانک غائب ہو گئے۔ کم از کم رقم تو فوراً پہنچا کر جاتے۔ وہ تمہارا ملک..... وہ تو

درندہ تھا درندہ۔ میری بیٹی ابھی تک بیمار ہے۔ ساری زندگی میں اس کے سامنے آنکھیں اٹھا کر

بات کرنے کے قابل نہیں رہی..... اور تم ہو کہ..... خیر چھوڑو ان باتوں کو لاؤ رقم نکالو۔“

اس نے ارسلان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”بی بی! میں نے تو سوچا تھا کہ چلو کچھ میرا بھی بن جائے گا اور تمہارا بھی بھلا ہو جائے

گا، لیکن تقدیر کے آگے تدبیر بھی نہیں چلتی۔“ ارسلان نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

”کک..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ مختار اں بائی کے ہاتھ سے گلاس گرتے گرتے

پچا تھا۔ اس نے بمشکل منہ میں رکھی ٹھنڈی سیون اپ کا گھونٹ حلق میں انڈیلا اور گلاس میز پر رکھ کر

اس کی طرف گھورنے لگی۔

”دراصل بی بی! کوئی تیسرا ہم کو داؤ لگا گیا.....!“ ارسلان نے کہا۔

”دیکھو ارسلان بیٹا! ہم کبھی لوگ ہیں۔ ہم زمانے کو چارتے ہیں۔ ابھی ہمیں چارنے

والا کوئی مائی کالا ل پیدا نہیں ہوا۔ میرے ساتھ کوئی چکر والی بات نہ کرنا۔ میں سیدھی عورت ہوں

لیکن اتنی سیدھی بھی نہیں۔ ہاں! یہ تمہیں پہلے سے بتا دوں۔“ مختار اں کا بلڈ پریشر گفتگو کے آغاز ہی

پر بڑھنے لگا تھا۔

”دیکھو بی بی! میں نے آج تک تم سے کبھی ہیرا پھیری کی بات نہیں کی۔ ٹھیک ہے تم

طوائف ہو لیکن طوائفوں والی زبان میں مجھ سے گفتگو نہ کرنا۔ کسی سالے کا لے کر نہیں کھاتا کہ کسی

کی دھونس میں آؤں گا۔ آج تک تمہارا بھلا ہی کیا ہے۔ تمہارے بڑے بڑے کام کروائے ہیں

میں نے..... اور آج بھی تم اس بازار میں میری ہی وجہ سے سر اٹھا کر چل رہی ہو۔ تھانے والوں کو

بھنبک بھی پڑ گئی کہ ملک صاحب نے تمہارے سر پر سے ہاتھ اٹھالیا ہے تو تمہاری بیٹی کی ہڈیاں چبا

جائیں گے۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے کہنے پر میں نے دو تھانے داروں کو یہاں سے ذلیل کروا کر

نکلوایا ہے۔“

ارسلان نے بھی مختار اں کے نپلے پر دھلا مارا تھا.....! اس بدلے ہوئے روپ نے

مختار اں کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے۔ وہ بھی بڑی خراٹ کجری تھی۔ کیا مجال جو اس نے

”حرام خور مجھے پولیس کا ٹاؤٹ بننے کا مشورہ دے رہا ہے۔ اچھا بیٹا! جس روز میری داڑھ کے نیچے آگیا ہڈیاں نہ چبالیں تو لعنت ہے میرے جنم پر بھی!“
غصے سے ہانپتے ہوئے وہ چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔

ڈیرے کے ملازم حیرانی پریشانی کے عالم میں بوکھلائے پھرتے تھے۔ عموماً ارسلان باؤ کی آمد پر انہیں بخشیش ملا کرتی تھی لیکن آج بے بھاؤ کی گالیاں مل رہی تھیں۔ اتنی گندی زبان بولتے انہوں نے مختاراں بائی کو کبھی نہیں سنا تھا۔



سودا کیا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹا نکالا اور ہزار ہزار کے پانچ نوٹ گن کر مختاراں بائی کو تھما دیئے۔

○

لاکھوں کی آس مند مختاراں بائی نے نیم مردہ بازو اس کی طرف بڑھا دیا اور لرزے ہاتھ سے نوٹ پکڑ کر اپنے گریبان میں اڑے ہوئے میں ڈال کر اسے واپس اپنی جگہ رکھ لیا۔
اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دل کو روئے یا جگر کو پیٹے۔ جس طرح وہ لٹی تھی کتنے بادشاہوں کو فقیر کیا تھا اس نے۔ ساری زندگی میں اس نے فتح مندیاں حاصل کی تھیں۔ اب عمر کے اس حصے میں ایک ہی شکست نے اسے اوندھے منہ زمین بوس کر دیا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں پیروں سے جان نکلی محسوس ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر اس وقت کا ماتم کر رہی تھی جب اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے اور وہ ارسلان کے چکر میں پھنس گئی۔

اگر ارسلان جھوٹ بھی بول رہا تھا تو وہ اس کا کیا بگاڑ لیتی؟ الٹا اس کو نقصان ہوتا۔
خربوزہ چھری پر گرگرتا یا چھری خربوزے پر۔ اسے تو یہ خوف دامن گیر ہونے لگا تھا کہ کہیں کل کلاں یہ ارسلان باؤ ہی اسے بلیک میل نہ کرنے لگے۔

بری طرح پھنس گئی تھی مختاراں.....!

سانپ کے منہ میں چھپکلی والی بات بن گئی تھی.....!

بجھے بجھے دل سے وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اب وہ اس کے سوا کیا کر سکتی تھی
کمبر شکر سے کڑھتی رہے یا پھر کوئی تھانے کچھری کا کیس پکڑ کر دالوں کی طرح اپنی کمیشن وصول کر لیا کرے۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ ارسلان کا منہ نوح لے لیکن ایسا وہ سوچ ہی سکتی تھی۔

ادھر ادھر کی چند الٹی سیدھی باتیں کر کے ارسلان وہاں سے رخصت ہو گیا۔ جاتے جاتے اس نے مختاراں بائی کو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی اسے ٹیلی فون نہ کیا کرے۔ ہاں اگر پولیس والے تنگ کریں تو کوئی بات نہیں۔ تب وہ اسے مطلع کر دیا کرے۔ اس نے مختاراں بائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر تھانے والوں کو کھلوادے گا کہ اس کا خیال رکھیں۔

”کتے کا بچہ!“ اس کے رخصت ہوتے ہی مختاراں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

یہی اس کا منشا تھا۔
لیکن.....!

پھر اس نے سوچا کہ آخر وہ ”فلور کراسنگ“ کرے کیوں؟ اس کا مطلب تو پورا ہو ہی رہا تھا۔ اس صوبے میں کوئی حکومت اس کی مرضی کے خلاف نہ بن سکتی تھی نہ چل سکتی تھی..... اس کے ہاتھ میں ”سٹوڈنٹ پاور“ تھی اور اس مضبوط ہتھیار کو وہ جب بھی چاہتا تھا اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔

حالات ایسے تھے کہ اگر اس ملاقات کی معمولی سی بھٹک بھی پریس کے کان میں پڑ جاتی تو اس کا سارا سیاسی کیریئر تباہ ہو کر رہ جاتا۔

فی الوقت اس نے خاموشی ہی اختیار کرنا مناسب جانا اور جس ذریعے سے مرکزی حکومت نے اس سے رابطہ کیا تھا اس کو ملک صاحب نے معذرت کر دی۔
لیکن.....!!

دوسرے ہی روز جب اس کے فون پر ایک انتہائی ذمہ دار شخصیت نے براہ راست اس سے بات کی تو وہ چونکا۔

”ملک صاحب! آپ سیاست دان ہیں۔ حالات و واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھئے۔ اس ملاقات میں فائدہ آپ کا ہی ہے۔ جذباتی فیصلے بسا اوقات نقصان دہ بھی ہوتے ہیں۔“

آخری الفاظ مخاطب نے خاصے چبا کر ادا کئے تھے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ مجھے دھمکا رہے ہیں؟“ ملک کو غصہ آ گیا۔

”نہیں ملک صاحب میں آپ کو حالات کی سنگینی سے باخبر کر رہا ہوں۔ اطلاعاً عرض

ہے کہ یہ دونوں مقتول لڑکوں کا کیس ہے جن کے اغوا پر آپ نے خاصی ہنگامہ آرائی کر رکھی ہے۔

سیکورٹی انجینی نے ان کے قتل کا سراغ لگا لیا ہے اور اس مسئلے پر گفتگو کے لئے آپ سے زیادہ ذمہ

دار اور مناسب شخص اور کون ہو سکتا ہے۔“

دوسری طرف سے کہا گیا۔

ملک صاحب ایک مرتبہ چکر اکر رہ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی یہ کیا معاملہ ہے اور ان

صیاد اپنے دام میں

ملک صاحب کے لئے مرکزی وزیر کی طرف سے ملاقات کی خواہش اہم اور چونکا دینے والی خبر تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ انکار کرے یا اقرار کر لے۔ اس خواہش کو وہ اب تک کئی معنی پہنا چکا تھا۔ وہ سیاسی آدمی تھا اور اسے بیک وقت دوستوں اور دشمنوں سے تعلقات پر نظر رکھنا ہوتا تھا۔ جس ملک میں وہ سیاست کا گھناؤنا کھیل کھیل رہا تھا وہاں کوئی لگے بندھے نکلے اصول و ضوابط تو تھے نہیں۔ اس بزنس کا ”کوڈ آف کنڈکٹ“ یہی تھا کہ حکومتی ایوانوں تک رسائی حاصل کر دو خواہ اس کے لئے کوئی ساطریق کار بھی اختیار کرنا پڑے۔

انتخابات کا اعلان کسی بھی دم ہوا چاہتا تھا۔

ملک نے پہلے ہی اندازہ لگایا تھا کہ ممکن ہے مرکزی پارٹی اسے کوئی بڑی ”آفر“ دینے جارہی ہو کیونکہ اس کا اپنا پریشہ گروپ بڑا مضبوط تھا اور اس بات کا علم تو ملک کے بچے بچے کو تھا کہ مرکزی پارٹی کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا اگر کسی سے تھا تو وزیر اعلیٰ کی شخصیت تھی۔

اگر ملک جیسا اہم سیاسی لیڈران کے قابو میں آ جائے تو مرکزی پارٹی کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو سکتی تھی۔ ملک نے پہلے تو یہی سوچا کہ وہ معاملات کو خود دیکھ لے۔ آخر ملاقات میں ہرج ہی کیا ہے۔ عین ممکن ہے اسے اگلا وزیر اعلیٰ ہی بنا دیا جائے۔

فی الوقت ان کے لئے حالات کے سامنے ہتھیار ڈالتے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

”مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔ جیسے ہی وہ آئے میرے کمرے میں بھیج دینا۔“ اس نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ چکاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن اب آپ اس کو فری کر دیں۔ ہمارا کام خاصا بڑھ گیا ہے۔ میں نے اس مرتبہ انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے مجھے بھی خاصا ”ہوم ورک“ کرنا ہے۔“ اس نے ملک صاحب کو خبردار کر دیا۔

دل ہی دل میں اپنی جیتی کو ایک بڑی سی گالی نکال کر وہ اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔ ملک بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ ہارنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

”ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی مونچھوں کو حسب عادت تاؤ دیا۔

O

اگلے ہی روز..... ملک کے ایک بڑے اخبار میں جس کے چیف رپورٹر کی ملک نے ”بڑی فرمائش“ پوری کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی اس کی ذاتی زندگی کے متعلق ایک چار کالمی خبر صفحہ اول پر لگا دی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ملک صاحب کے بیگم صاحبہ سے تعلقات خاصے کشیدہ ہیں اور کسی بھی لمحے ان دونوں کے درمیان علیحدگی ہو سکتی ہے۔ اخبار نے مسز ملک کے قریبی حلقوں کے حوالے سے یہ انکشاف بھی کر دیا تھا کہ اس کا ذاتی بزنس ملک سے باہر تک پھیلا ہوا ہے۔

اس خبر کی ایسے موقع پر اشاعت نے جب انتخابات سر پر آ رہے تھے ملک صاحب کے لئے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے تھے اور اب وہ پریس کو کم از کم اپنی بیگم کے حوالے سے کوئی خبر دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

سب سے پہلے ملک کو اب اس خبر کا نوٹس لینا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے دوسرے بڑے اخبار کا نمبر ملایا اور تھوڑی دیر بعد وہ اس اخبار کے سٹاف رپورٹر سے جو گفتگو تھا۔

”سلیبی صاحب! آپ جانتے ہیں کہ ہم یاروں کے یار ہیں۔ یہ تو بڑی گھٹیا حرکت

کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مخالف نے گوکہ بڑے احترام سے یہ خبر ان تک پہنچائی تھی لیکن اس احترام کے پس پردہ موجودہ دھمکی کو ان سے زیادہ اور کون سو گھسکتا تھا۔

اس کے لئے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔

”ٹھیک ہے بھئی۔ صاحب ہم سیاسی لوگ ہیں۔ ملاقات کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔“ ملک نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ملک صاحب۔ اگر آپ کے پاس کل کوئی وقت ہو تو میں اریج کر دوں۔ وزیر داخلہ کل آپ سے بات کریں گے۔“

”کل پانچ بجے کا وقت رکھ لو۔“ ملک صاحب نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

”شکریہ جناب! مجھے آپ سے یہی امید تھی۔“ کہہ کر ذمہ دار نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

فون رکھنے کے بعد ملک صاحب نے سب سے پہلے ارسلان کو طلب کیا تھا۔

”ارسلان کہاں ہے؟“ اس نے مسز ملک سے دریافت کیا جو ڈرائنگ روم میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔

”کسی کام سے گیا ہے۔ ایک میٹنگ کا بندوبست کرنے۔“ نجمہ بیگم نے لاپرواہی سے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اسے فوراً بلاؤ۔“ ملک صاحب کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

”ملک صاحب! اپنے آپ میں رہا کیجئے۔ آج کل آپ کچھ زیادہ ہی لفٹ لینے لگے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میں ڈرنے یا دبنے والی نہیں ہوں اور اب دھمکیوں اور دھونس کا وقت بھی کبھی کا گزر چکا۔ میں آپ کے پائے کی سیاسی لیڈر ہوں۔ اس نوعیت کی دھمکیاں ہمیں نے اس وقت بھی پسند نہیں کی تھیں جب میں عام عورت تھی۔ ملک صاحب ارسلان میرا پرسل سیکرٹری ہے اور اب بزنس پارٹنر بھی۔ آپ کو میرے ”بزنس“ کا علم تو ہو گا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ میرے بزنس کا خیال رکھیں اور اپنے بزنس کا بھی۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے کنٹرول کے ذریعے ٹی وی آف کر کے ملک کو قریب آڈانٹے ہوئے کہا۔

”اوہو! نجمہ بیگم.....! میں بہت پریشان ہوں۔ اس کی ضرورت ہے بہت شدت سے۔“ ملک نے ہوا کے رخ کو پہچانتے ہوئے کہا۔

کہ اس کے نام کا لفظ بڑی خطیر رقم کے ساتھ موصول ہو گیا ہے۔

سیلی نے فوراً ہی خبر تیار کر دی تھی۔ صوبائی لیگ اس کی ”بیٹ“ تھی اور اس نے ملک صاحب کی بیگم کی طرف سے ایک لمبا چوڑا تردیدی بیان تیار کر دیا تھا جس میں نہ صرف مخالف اخبار کی خبر کی سختی سے تردید کی گئی تھی بلکہ اسے زرد صحافت کی مثال قرار دے کر اخبار کو نوٹس بھیجنے کی بات بھی شامل کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ خبر کا آخری حصہ اس کے اخبار کے مالک کو جو اخبار کا مدیر بھی تھا بہت پسند آئے گا۔

○

ارسلان ملک صاحب کے سامنے موجود تھا اور اس کے ذہن میں اپنی بیگم کی یہ ”اطلاع“ گونج رہی تھی کہ اب ارسلان اس کا بزنس پارٹنر ہے اور ملک کو اپنی بیگم کے ”بزنس“ کا بخوبی علم تھا۔ اس کی ایک اور سالی اور نزدیکی رشتہ دار عورت پہلے ہی اس کی بیگم کے ”بزنس“ کی بھیئت چڑھ چکی تھیں اور آج کل لندن کی مختلف جیلوں میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہی تھیں۔ خیریت تو یہ گزری کہ اب بھی کسی اخبار والے تک یہ بات نہیں پہنچی تھی.....!

ملک صاحب کے ساتھ پانچ سال بسر کرنے کے بعد اب نجمہ بیگم بھی اس کی بہت سی ”آف دی ریکارڈ“ باتوں کی عینی شاہد بن چکی تھی اور اگر وہ اس کے خلاف کوئی اقدام اٹھاتا تو نہ جانے وہ کیا کر گزرتی۔

اسے رہ رہ کر اس دن کا پچھتاوا ہو رہا تھا جس روز اس نے ایک گھریلو تقریب میں سجاد خان کا تعارف اپنی بیوی سے کروا دیا تھا۔ اس نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ معمولی سی استانی خود ہی سجاد خان سے اپنی لائن سیدھی کر لے گی۔

اسے بہت دیر بعد اس حقیقت کا احساس ہوا تھا کہ دراصل اس نے نجمہ کا شکار نہیں کھیلا تھا بلکہ خود اس کا شکار ہوا تھا.....!!

اس مڈل کلاس سانوئی سی لڑکی نے جس کو رونق محفل بنا کر ملک صاحب سیاست کے میدان میں اپنے مہرے آگے بڑھانے جارہے تھے دراصل ملک صاحب کی شہرت، عزت اور دولت کی بیساکھیوں کے سہارے اپنے قدم اتنی مضبوطی سے گاڑ لئے تھے کہ اب اسے اکھاڑنا خاصا مشکل رکھائی دے رہا تھا..... اب وہ ملک کی ضرورت ہی نہیں، کمزوری بھی بن چکی تھی۔

ہوئی ناں۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے اگر ہماری پگڑی اچھالیں گے تو پھر ہم سے خیر کی توقع کرنا تو بے انصافی ہے ناں سائیں۔“

”بجائے فرمایا ملک صاحب! اصل میں کالی بھڑیں ہمارے پیٹے میں بھی گھس آئی ہیں۔ یہ ڈبل کر اس لوگ ہیں ملک صاحب جدھر سے زیادہ ہڈی پڑی اس طرف منہ اٹھا کر دم ہلانے لگے اور پھر ملک صاحب آپ نے بھی تو چیف رپورٹر صاحب کو زیادہ ہی سر پر چڑھا لیا ہے۔ ہمیں تو آپ نے بھلا ہی دیا تھا ملک صاحب۔“ سیلی کو اس سے بہتر موقع کب ملنا تھا۔

واقعی ملک نے آج چھ ماہ کے بعد اس سے براہ راست بات کی تھی۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی چھوٹے رپورٹر کو گھاس ڈالنا پسند نہیں کیا کرتا تھا۔ حالانکہ سیلی اس کا سب سے پرانا نمک خوار تھا اور اس نے ملک کی شان میں قصیدے لکھ لکھ کر اسے وہاں پہنچا دیا تھا جہاں پہنچ کر ملک اپنی اوقات بھول گیا تھا۔

”سیلی صاحب! اگر آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ انشاء اللہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ تو سائیں اپنے آدی ہیں ناں اور گھر کے لوگوں کو بھلایا نہیں جاتا۔“ ملک نے ایک لمحے کے لئے بھی سیلی صاحب کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”ملک صاحب ہم چھوٹے لوگ ہی برے وقت میں آپ جیسے بڑے لوگوں کے کام آیا کرتے ہیں۔ حکم کیجئے۔“

”بس سائیں آپ خود سمجھدار ہیں۔ جو ہرزہ سرائی اس گھٹیا شخص نے بیگم صاحبہ کے حوالے سے کی ہے۔ اس کی شاندار سی تردید کر دو۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے بیان آنا چاہئے اور ایسا بیان آئے کہ اس کو بھی ثانی یاد آ جائے۔ باقی میں خود نوٹس لوں گا اور ہاں! بچوں کی مٹھائی تھوڑی دیر تک آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔“ ملک صاحب نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ملک صاحب! بس آپ بے فکر ہو جائیں۔“ سیلی کی باجھیں کھل گئیں۔ اتنی موٹی مرغی دوبارہ اس کے جال میں پھنسی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں کم از کم ملک صاحب ضروریاروں کے یار ہیں۔

ملک صاحب کے فون رکھنے کے بمشکل پندرہ منٹ بعد ہی اس کو گھر سے فون آ گیا تھا

سب سے پہلے تو اسے خود کو ارسلان سے بے نیاز کرنا تھا جس کے لئے اس نے ابھی سے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔

○

اگلے روز جب اس نے اخبار میں اپنی بیگم کی طرف سے ایک زبردست تردیدی بیان پڑھا تو اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہو گیا۔

سیلی نے خوب خوب حق نمک ادا کیا تھا۔ ملک اندازہ کر سکتا تھا کہ مخالف اخبار کے رپورٹر کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے کیونکہ اس کا مالک کسی بھی نوٹس کا تحمل نہیں ہو سکتا۔

اب اسے خود کو آنے والی ملاقات کے لئے تیار کرنا تھا۔ اس کے علم کی حد تک دونوں لاشوں کا علم جو ناقابل شناخت قرار دلا کر اس نے فن کروادی تھیں سوائے اس کے اور کسی کو نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اطمینان کے لئے کرائمر برانچ میں اپنے ایک دیرینہ دوست آفسر کو فون کر کے باتوں باتوں میں مختلف طریقوں سے اس کیس کے متعلق کسی نئی اطلاع سے متعلق جاننا چاہا لیکن کوئی کام کی بات اس کے پلے نہ پڑی۔

دوسری بڑی سرکاری ایجنسی جو اس کیس کو دیکھ رہی تھی اس کے سٹوڈنٹس معاملات کے انچارج کا تبادلہ ہو چکا تھا اور ابھی تک کسی اور نے باقاعدہ چارج اس ڈیک کا نہیں سنبھالا تھا۔ ملک سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ آخر کیا گیدڑ سنسکھی ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے اس نے ملاقات کے مقام کا تعین بھی کر دیا۔ وہ بڑا محتاط ہو کر گھر سے نکلا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو معمولی سی بھٹک بھی اس ملاقات کی پڑے۔

وہ ریٹ ہاؤس جس میں ملک صاحب اور مرکزی وزیر داخلہ کی ملاقات طے پائی تھی شہر سے خاصا دور تھا اور ملک کی ہدایت پر ریٹ ہاؤس خالی کروالیا گیا تھا۔ اپنی بجا رو چیپ میں وہ ایک باڈی گارڈ کے ساتھ آیا تھا۔ ریٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں وزیر داخلہ اس کا منتظر تھا۔

”ملک صاحب! اصل میں آپ وہاں ”مس فٹ“ ہیں اور آپ جیسے تجربہ کار راہنماؤں کی جتنی ضرورت ہماری پارٹی کو ہے وہ اور کسی کو نہیں۔ سو ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو اپنا لیڈر بنا کر رہیں گے۔“ وزیر داخلہ نے حال احوال دریافت کرنے کے بعد اپنا برفیاف کیس

اور.....!

یہ لڑکا ارسلان..... جسے اس نے زمین سے اٹھا کر سر پر بٹھایا تھا۔ وہ بھی اب اس کی بیوی کا ”شکار“ بن چکا تھا۔ ملک کے لئے سوائے اس کے فی الوقت کوئی سکوپ نہیں تھا کہ وہ اپنا گھوڑا اپنے میدان میں بھگائے۔ اگر اس نے نجمہ بیگم کے ٹریک میں قدم رکھا تو شاید اسے توقع سے بڑھ کر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔

”ارسلان بیٹا! اگر تمہارے پاس اختر اور جاوید کے متعلق کوئی اطلاع موجود ہے جو تم نے ابھی تک مجھے منتقل نہیں کی تو وہ مجھے بتادو..... دوسری صورت میں خدا نخواستہ کوئی مصیبت آگئی تو شاید میں بھی تمہاری مدد نہ کر سکوں۔ سیکورٹی والوں کو شاید کوئی کلومل گیا ہے اور اس سے پہلے کہ بات فائلوں سے آگے نکلے۔ میں اس کیس کو ختم کر دینا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔“

ملک صاحب نے ہوا میں تیر چلا کر شاید ارسلان کو خوفزدہ کرنا چاہا تھا، لیکن وہ اندازہ نہ کر پایا کہ اب ارسلان بھی کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں رہا۔ اس نے بھی اب بچوں کے بل کھڑے ہو کر کندھوں سے اوپر جھانکنا شروع کر دیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ملک صاحب جھوٹ بول کر اسے خوفزدہ کرنا اور اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان تک ایسی کوئی اطلاع پہنچی ہوتی تو وہ ضرور اس کے علم میں بھی آگئی ہوتی۔

”ملک صاحب! مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میرے متعلق یہ غلط رائے کیسے قائم کر لی؟ ملک صاحب میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ میں کبھی آپ سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور آپ سے کچھ چھپانا آپ سے غداری کے مترادف سمجھتا ہوں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ تم بے فکر رہنا۔“ ملک نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

وہ بڑا محتاط ہو گیا تھا۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر ہی اگلا کوئی بھی قدم اٹھانا تھا۔ وہ اپنے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکال سکتا تھا جو اشارتا بھی اس کے عزائم کی عکاس ہوئی۔ اس مرتبہ وہ کوئی مزید دھوکا کھائے بغیر میدان مارنا چاہتا تھا۔ اس نے نجمہ بیگم کے منہ سے اگلنے والا سارا زہر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا اور اب اسے بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا تھا۔

مجمیٹ جس نے یہ احکامات جاری کئے تھے آپ کے خلاف تحریری بیان دے چکے ہیں۔
بیانات کی نقول بھی ملاحظہ فرمائیں۔“ اس نے ایک فائل میں لگے فوٹو سٹیٹ کاغذ ان کی طرف
بڑھا دیئے۔

○

ملک نے کپکپاتے ہاتھوں سے باری باری ان سب چیزوں کا جائزہ لیا۔ اس کے دل
کی دھڑکن بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔
کوئی خواب ہے.....!

کوئی واہمہ ہے یا کچھ اور.....!

لیکن.....!!

یہ بڑی تلخ سچائی تھی جس کا ادراک اب ملک صاحب کو ہونے لگا تھا۔ وہ بری طرح
پھنس گئے تھے۔ مخالفین نے بڑی محنت سے کیس تیار کیا تھا اور ملک صاحب کے فرار کی کوئی راہ باقی
نہیں چھوڑی تھی۔

”گویا آپ مجھے بلیک میل کرنے جا رہے ہیں۔“ نجانے ملک کے حلق سے کیسے پھنسی
پھنسی آواز نکلی۔

”نہیں ملک صاحب ہرگز نہیں۔ یہ تو ”ذیل“ ہے۔ ہماری آفر ہے، پیشکش ہے۔
سیاست میں کوئی کسی کو بلیک میل نہیں کرتا۔ ہر کوئی اپنی ضرورت اور اہمیت کا سودا کرتا ہے۔ ملک
صاحب کمال ہے آپ اسے بلیک میلنگ کہہ رہے ہیں۔ یہ تو دوطرفہ معاہدہ ہے۔ ہم آپ کو بہت
کچھ دے رہے ہیں۔ بہت کچھ ”لوڑ“ کر رہے ہیں۔ اتنا کچھ شاید آپ کی پارٹی آپ کو کبھی نہ دے
سکے۔ آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس مرتبہ بھنڈر بھی خاموش نہیں بیٹھے گا.....
آپ کے وزیر اعلیٰ نے اگر آپ ہی کو خوش رکھا تو وہ لوگ ہمارے ساتھ آ ملیں گے۔ آپ یہ تو
مانیں گے کہ اس کے بعد اس صوبے میں کم از کم آپ کی پارٹی کی حکومت نہیں بنے گی اور جہاں
تک ہمارا سوال ہے تو ملک صاحب ہمارے دروازے تو سب کے لئے کھلے ہیں۔ سیاست میں
کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا بلکہ نئے راستے تلاش کئے جاتے ہیں۔“ وزیر داخلہ نے گہری سانس
لے کر کہا۔

کھولتے ہوئے ملک صاحب سے کہا۔

ایک مؤدب ویران کے سامنے مشروبات رکھ کر باہر چلا گیا تھا اور اب کمرے میں
ملک صاحب اور وزیر داخلہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

”لیکن میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یوں بھی آپ جانتے ہیں کہ چھوٹی کشتیاں اگر
کنارے کے نزدیک ہی رہیں تو ہی سلامت رہتی ہیں۔ ہم تو سائیکس معمولی سے بندے ہیں۔ یہ
بڑے کھیل کھیلنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔“ ملک نے بھی مسکراتے ہوئے چائے کا گھونٹ حلق میں
اٹھال کر کہا۔

”ملک صاحب! مجھے وزیر اعظم کی طرف سے حکم ملا ہے کہ آپ سے بات کروں۔ ہم
چاہتے ہیں کہ مستقبل میں آپ ہمارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلیں۔ اس صوبے میں اگر آپ جیسے
محترم اور بااثر لوگ ہمارے ساتھ تعاون کریں تو انشاء اللہ ہم مل کر اس ملک کے لئے بہت کچھ کر
سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے آپ کو یہ بھی آفر موجود ہے کہ اگر آپ صوبے کی وزارت اعلیٰ چاہیں
یا اپنی مرضی سے وزارت بنوانا چاہیں تو ہم حاضر ہیں۔ اگر آپ مرکز میں آنا چاہیں تو بھی آپ کے
مطلب کی منبری آپ کو مل جائے گی۔“ وزیر داخلہ نے ایک ایک کر کے اس کے سامنے پتے پھینکنے
شروع کئے۔

”سائیں آپ مجھے معاف ہی رکھیں۔ ابھی میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ دال روٹی
جیسے تیسے چل رہی ہے۔“

وزیر داخلہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ ملک ایسے سنہری جال میں پھنسنے والا نہیں۔ بلاآخر اس
نے تپ کا پتہ پھینک ہی دیا۔

”ملک صاحب یہ دو تصاویر آپ کے معائنے کے لئے حاضر ہیں۔“ اس نے مقتول
نواز اور اختر کی تصاویر اس کے سامنے رکھے ہوئے کہا۔ ”پولیس رپورٹ کے مطابق یہ دونوں
لڑکے ذہنی کر کے فرار ہو رہے تھے کہ آپس کے مقابلے میں مارے گئے۔ انہوں نے بینک کی
جس وین کو لوٹا تھا اس کے تمام سواروں کو بھی مار ڈالا تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ ان کا کوئی تیسرا
ساتھی بھی تھا کیونکہ رقم وہاں سے غائب ہے۔ بہر حال یہ پولیس کا مسئلہ ہے۔ وہ ڈین ایس پی
جس نے آپ کے حکم سے ان لاشوں کو ناقابل شناخت قرار دے کر دفنانے کی ہدایت کی تھی اور وہ

حاسد زیادہ ہیں۔ وہ جانے کب سے کسی ایسے موقعے کے منتظر رہتے ہوں گے۔
اس نے دو تین روز میں ہی اپنی نئی سیاسی حکمت عملی کا اعلان کرنا تھا اور یہ احتیاط بھی
ملاحظہ خاطر رکھنی تھی کہ وقت سے پہلے کھیل ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔
وزیر داخلہ سے اس کی ذیل طے پاگئی تھی.....!



”لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس طرح انقلابی طلباء تنظیم میرے ہاتھ سے نکل جائے
گی۔“ ملک نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

”ہرگز نہیں۔ ہمارے پاس تمام منصوبہ تیار ہے۔ آپ آج رات کو ہی اجلاس طلب کر
لیں۔ طلباء تنظیم میں دو واضح گروپ موجود ہیں۔ نوید گروپ کو آپ نے ابھی تک نظر انداز کیا ہے۔
ان لوگوں کو ہاتھ میں رکھیں اور بجن گروپ کی پرواہ نہ کریں۔ ان لوگوں کی قیمت پانچ لاکھ سے زیادہ
تو نہیں ہوگی۔ پیسوں کی آپ فکر نہ کریں..... یہ دوسرا بریف کیس آپ کے لئے ہے۔ ملک
صاحب! جیسے بھی ممکن ہو بجن گروپ کے کچھ لوگوں کو خرید لیجئے۔ اول تو اس کے بعد صوبائی لیگ
کے لئے کچھ باقی نہیں بچے گا۔ اگر ایسا ہوا بھی تو بے فکر رہئے۔ ہمارے پاس متبادل منصوبہ بھی
موجود ہے۔“ وزیر داخلہ نے پائپ کے دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ مجھے اس سے بھی آگاہ کر دیں۔ اس طرح میں زیادہ بہتر
پلاننگ کر سکوں گا۔“ ملک نے یہ کہتے ہوئے دوسرا بریف کیس اٹھا کر اپنے نزدیک کر لیا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب ملک صاحب ان کی ”ذیل“ میں پھنس گئے ہیں۔
”یہ اختر اور جاوید کے قتل کی کہانی بھی تو ابھی منظر عام پر نہیں آئی۔ اس الزام میں دس
بارہ سر پھروں کو تو گرفتار کیا ہی جاسکتا ہے۔ ہم اس ڈکیتی کو ”باغیوں“ کے خلاف استعمال کر سکتے
ہیں۔ ملک صاحب جب 302 کے تحت چالان کی دھمکی ملی تو بڑے بڑے شیر بھی گدھے بن کر
آپ کے سامنے دم ہلانے لگیں گے۔ یہ تو آپ کو علم ہو گا ہی کہ پولیس نے ان کے خلاف کتنے
کیس رجسٹر میں دبار کھے ہیں۔“

ملک کی کامیابی کا راز ہی یہی تھا کہ اس نے وقت سے سمجھوتے کے سنہری اصول کو حرز
جان بنالیا تھا اور ہمیشہ حالات سے مفاہمت کر کے آگے نکلنے کی کوشش کی تھی۔

ملک صاحب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب انہیں سیاست میں اپنی ترجیحات کو بدلنا ہوگا
بصورت دیگر ان کے لئے جیل کا دروازہ کھل جائے گا اور ایک مرتبہ وہ جیل میں پہنچ گیا تو اس کو
یقین تھا کہ پھر کبھی باہر نہیں آ سکے گا، کیونکہ صوبائی لیگ کے لوگ بھی اس کی حمایت اس کے
”پریشر“ کی وجہ سے کرتے تھے اور جیسے ہی اس کا پریشر گروپ ختم ہوتا ہے۔ وہ اس کی جان کو آ
جاتے۔ ملک صاحب جانتے تھے کہ صوبائی لیگ میں ان کے دوست کم اور منافق نما دوست اور

لئے خاصے ثبوت بھی جمع کر لئے ہیں۔“
اس نے اپنی بات مکمل کی۔

”ملک صاحب! آپ جیسے گھاگ جہاندیدہ کا کوئی سیاسی فیصلہ غلط تو ہونے سے رہا۔ ظاہر ہے آپ نے کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا لیکن اس بات کی ضمانت مرکزی پارٹی سے ضرور حاصل کر لیں کہ وہ اگلی اسمبلی میں خواتین کی مخصوص نشستوں میں سے ایک میرے لئے مختص رکھیں گے اور سوشل ویلفیئر منسٹری بھی..... آپ جانتے ہیں کہ میں ویلفیئر کے کاموں میں دن رات مصروف رہتی ہوں اور اس وزارت پر مجھ سے زیادہ اور کسی کا حق بھی نہیں۔“ اس نے سگریٹ سلاگتے ہوئے ملک صاحب سے کہا۔

نجمہ بیگم جانتی تھی کہ ملک صاحب نے اس سے ضرور کوئی بات چھپالی ہے۔ اس کے ذہن نے اپنا مستقبل محفوظ کرنے کی راہ اسے سب سے پہلے بھنائی تھی۔

”ارے نجمہ بیگم سائیں! ہم تو سیاست ہی تمہارے لئے کر رہے ہیں۔ تم اپنی ”پورٹ فولیو“ محفوظ سمجھو۔“ اس نے نجمہ کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اب وہ ارسلان کا منتظر تھا.....!

اس نے اپنی ہونہار ریفیٹ حیات سے مشاورت شروع کر دی تھی اور اسے بتا دیا تھا کہ انقلابی طلباء تنظیم کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لئے اس نے کیا منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں اسے ارسلان کی مدد درکار تھی اور تھوڑی دیر بعد ارسلان وہاں موجود تھا۔

ملک صاحب نے اس کے ساتھ وزیر داخلہ کی ملاقات کا ذکر کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ پولیس نے ذکیقتی کے مفروضہ کے خلاف بھی مقدمہ درج کر لیا ہے البتہ ایف آئی آر فی الوقت سربمہر کر دی گئی ہے اور مناسب وقت پر دوبارہ فائل کھول دی جائے گی۔

○

ارسلان تھوڑی دیر بعد اپنی گاڑی لے کر ہنگامی آپریشن کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی واپسی رات دیر گئے تک ہوئی تھی، لیکن اس کیلئے نہیں۔ اس کے ساتھ انقلابی طلباء تنظیم کے اہم لیڈر بھی موجود تھے۔ ان لوگوں کا تعلق ارسلان والے گروپ سے تھا جب کہ جن گروپ کے لوگ دوسری جیب میں پہنچے تھے۔ آج پہلی مرتبہ طلباء تنظیم کے دس لیڈروں کو ایک ساتھ ملک صاحب نے اپنے

انکشاف

گھر پہنچ کر انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد بیگم کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔
”میں نے مرکزی پارٹی جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ اس نے نجمہ بیگم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ نجمہ بیگم کا سوال خلاف توقع نہیں تھا۔

”ایک تو ان لوگوں کی طرف سے ”آفر“ بہت اچھی ہے۔ دوسری طرف صوبائی لیگ میں میری مخالفت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اگر پارٹی صدر نے میری حمایت جاری بھی رکھی تو بھنڈر اپنے گروپ سمیت مرکزی پارٹی سے جا ملے گا اور صوبائی لیگ کے اس طرح مستقبل میں اس صوبے میں اپنی وزارت بنانے کے چانسز بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ بھنڈر مرکزی پارٹی سے ہاتھ ملائے میں خود کیوں نہ باعزت پیشکش قبول کر لوں۔“

اس نے نجمہ بیگم کو اپنی اور وزیر داخلہ کی ملاقات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور مجبوری بھی ہے کہ ان لوگوں نے میرے خلاف اختر اور جاوید کے اغوا کا کیس خاصا مضبوط تیار کر لیا ہے۔ تمہیں شاید علم نہ ہو کہ ان دونوں کی لاشیں لاوارث قرار دے کر دفنائی جا چکی ہیں اور مرکزی حکومت کی انٹیلی جنس ایجنسی نے میرے خلاف اندر ہی اندر مجھے پھانسنے کے

تھے یا پھر موقع ملنے پر ڈکیتی کی وارداتوں کا ارتکاب کرتے تھے۔

یہ لوگ سیاستدانوں کی ضرورت تھے اور ان کی ضرورت سیاستدان تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی کمزوری دوسرے کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوط کرتے رہتے تھے۔

ملک صاحب نے دو تین داؤ ہی ایسے لگائے کہ تمام لوگ منہ کے بل زمین پر آ گرے۔ جب لوہا گرم ہو گیا تو ملک صاحب نے چوٹ بھی لگا دی اور بریف کیس کھول کر اس میں موجود آدھی رقم بڑی ایمانداری سے ان سب میں برابر تقسیم کر دی۔ آدھی رقم انہوں نے اپنے لئے رکھ لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے ”نوجوان دوستوں“ کو مطلع کیا کہ وہ ان لوگوں کی بہبود کے لئے اپنا سیاسی کیریئر داؤ پر لگانے جارہے ہیں۔ انہوں نے حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے نوجوانوں سے کہا کہ ان کے جیتے جی پولیس کسی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے یہ ان کے لئے ناقابل برداشت ہے اور اب وہ محض اپنے نوجوان دوستوں کے لئے مرکزی پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔

جیسے ہی ملک صاحب کے منہ سے یہ بات نکلی۔ ارسلان نے تالیاں بجا دیں۔ باقی کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ وہ بھی اس جشن مسرت میں شامل ہو گئے۔ ان لوگوں نے باری باری ملک صاحب کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور کہا کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ ان کے اشاروں پر کھڑے چلیں گی طرح ناچتے رہیں گے اور انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی نوید گروپ اور بجن گروپ کے لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر ہو کر ملک صاحب کو یقین دہانی کروادی کہ ان کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہیں رہا اور وہ مستقبل میں مل کر اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلیں گے۔

ملک صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ کی طرح خود کو کبھی اکیلا محسوس نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نوجوان دوستوں سے یہ درخواست بھی کر دی کہ وہ کچھ عرصے کے لئے ذرا محتاط ہو جائیں کیونکہ مرکزی پارٹی اور صوبائی لیگ کے درمیان اینٹ کتے کا بیر ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ ان کے لئے مشکلات پیدا کرے۔

”ملک صاحب! دیکھیں ہم پر ایسی کوئی پابندی نہ لگائیں۔ گھوڑے بھاگتے ہی اچھے

بنگلے پراکٹھ کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ملک صاحب ان کو حالات کی اونچی نیچ سے آگاہ کر رہے تھے۔ انہوں نے سٹوڈنٹس لیڈروں کو بتا دیا تھا کہ اختر اور جاوید ڈکیتی کی ایک واردات میں مارے جا چکے ہیں اور پولیس نے ان کی لاشیں لاوارث قرار دے کر دفن بھی دی ہیں۔

ملک صاحب نے انہیں بتایا تھا کہ پولیس کو ان نوجوانوں کی بھی تلاش ہے جو ان کے ساتھ تھے اور بعد میں رقم لے کر فرار ہو گئے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کی طرف سے صوبائی پولیس پر پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور وہ انقلابی طلباء تنظیم کے تمام سرکردہ ممبران کے خلاف درج شدہ مقدمات کی فائلیں کھول کر انہیں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔

یہ لوگ جو یہاں جمع تھے جانتے تھے کہ وہ تمام کے تمام پولیس کو ڈکیتوں، اغوا، غنڈہ گردی اور توڑ پھوڑ کے واقعات میں مطلوب ہیں لیکن اختر اور جاوید والی واردات میں ان میں سے کسی نے حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر شک کر رہے تھے۔

یہ بات تو وہ بھی جانتے تھے کہ ان میں سے ہی کسی نے ڈکیتی کی رقم اڑائی ہوگی۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ ان میں سے کوئی اس واردات کا ذمہ دار نہیں؟

ملک صاحب نے انہیں ساری اونچ نیچ بتا کر ان کے پاؤں تلے سے پہلے تو زمین سرکائی اور انہیں باور کروایا کہ اب صورت حال ایسی ہو گئی ہے کہ اگر انہوں نے حکومتی پارٹی کی پیشکش قبول نہ کی تو وہ سب جیلوں میں چلے جائیں گے اور صوبائی لیگ ان کی مدد نہیں کر سکے گی کیونکہ ان سب کے خلاف بڑے سنگین نوعیت کے الزامات کے تحت مقدمات درج کئے گئے ہیں۔

○

یہ نوجوان جو یہاں جمع تھے ان کا تعلیم سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا۔ ان کا تعلق کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اگر کچھ تھا تو صرف اتنا کہ یہاں حاضری سے متعلق رجسٹروں میں ان کے ناموں کا اندراج تھا۔ خود تو وہ مہینوں کالج یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھا کرتے تھے۔ ان میں غالب تعداد ان نوجوانوں کی تھی جنہوں نے شہر میں باقاعدہ بد معاشی کے مراکز قائم کر رکھے تھے۔ یہ لوگ اپنا معاوضہ لے کر مکانات کے قبضے دلایا کرتے تھے۔

لوگوں کی جائیداد پر ناجائز قبضے کیا کرتے تھے۔ ویگن سٹینڈ سے اپنا ہتھ وصول کرتے

روز ”ہارس ٹریڈنگ“ کا شکار ہو جائے گا۔

رات دیر گئے جب صوبائی لیگ کے لوگوں نے ملک صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو انہیں مطلع کیا گیا کہ ملک صاحب ایک ضروری کام کے سلسلے میں دارالحکومت گئے ہیں۔ وہ رات کو ”نائٹ کوچ“ سے دارالحکومت روانہ ہو گئے تھے۔ اس بات کی تصدیق بعد میں ایئر لائن کے کاؤنٹر نے بھی کر دی۔

صبح جب وزیر اعلیٰ ناشتے کی میز پر تشریف فرما تھے۔ انہیں بھنڈر صاحب کی آمد سے مطلع کیا گیا۔ بھنڈر کے لئے تو بی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا۔ وہ ایسا موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیتا۔ رات ہی اس کے ایک ”صحافی ٹاؤٹ“ نے اس کو جب نیند سے جگا کر اس پریس کانفرنس کی اطلاع دی تو وہ سناٹے میں آ گیا۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ سچ بھی ہو سکتی ہے، لیکن یہ شخص جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔

بھنڈر کی نیند تو حرام ہوئی ہی تھی۔ اس نے راتوں رات اپنے گروپ کے پانچ چھ سرکردہ ممبر اپنے گھر اکٹھے کر لئے اور آدھی رات تک وہ لوگ اگلا لائحہ عمل طے کرتے رہے۔ بھنڈر ایک مرتبہ پھر مات کھا گیا تھا۔

اس نے اندر ہی اندر مرکزی پارٹی میں شامل ہونے کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں، لیکن ایک مرتبہ پھر ملک اس پر بازی لے گیا۔

”پھر کیا ہوا؟“

اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ کم از کم وہ ملک کو اب اس قابل نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ کبھی صوبائی لیگ میں واپس آ سکے۔

وزیر اعلیٰ نے بھنڈر گروپ کو ناشتے کی میز پر ہی طلب کر لیا۔ وہ بھی اس صورت حال سے خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے گو کہ اس سے پہلے وہ پارٹی معاملات میں اس کے مقابلے میں ملک کا ساتھ دیا کرتے تھے، لیکن اب اچانک ہی انہیں نئی سیاسی حکمت عملی اختیار کرنی پڑی تھی۔

”بہت بچ حرکت کی ہے ملک صاحب نے۔“ اس نے اپنے دل کے پھپھولے پھوٹتے ہوئے کہا۔ ”جناب والا! میں تو پہلے روز ہی سے اس شخص کی رگ رگ سے واقف ہوں۔

لگتے ہیں۔“

جن نے بد معاشوں کے سے لہجے میں بڑھک ماری۔

اس کے ساتھ ہی سب نے مل کر قبضہ لگایا۔ ملک صاحب نے بھی پیچھے ہٹنے کا پورا زور لگا کر اس میں حصہ لیا تھا۔ یہاں سے وہ الگ الگ گروپ میں واپس گئے تھے۔ جاتے ہوئے ایک ٹولی نے راستے میں آنے والے ایک پٹرول پمپ پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔

دوسرے روز دوپہر کو ایک فائیو سٹار ہوٹل میں انقلابی طلباء تنظیم کے دونوں گروپوں کی ایک مشترکہ پریس کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس چونکہ لچ پر بلائی گئی تھی اس لئے خاصی بارونق تھی اور ہر اخبار کار رپورٹر اور نوگرافر یہاں موجود تھا۔ تنظیم کے جنرل سیکرٹری ارسلان نے ایک ٹائپ شدہ بیان رپورٹرز میں تقسیم کر دیا جس میں صوبائی قیادت پر سنگین الزامات لگاتے ہوئے مستقبل میں صوبائی لیگ کے مکمل بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا تھا اور اس عزم کا اعادہ کیا گیا تھا کہ ماضی کی طرح آئندہ بھی انقلابی طلباء تنظیم کے نوجوان کسی سیاسی پارٹی کے آلہ کار نہیں بنیں گے اور طلباء کے حقوق حاصل کرنے کے لئے اپنا جہاد جاری رکھیں گے۔

اس بیان کے بعد اختر اور جاوید کے غائب ہونے کا الزام صوبائی قیادت پر عائد کرتے ہوئے یہ عہد یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ پولیس نے دونوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں غائب کر وادی ہیں۔

رپورٹرز میں سے کسی نے بھی کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو تھی جو ان کے سامنے میزوں پر سجائے جا رہے تھے اور دوسری اہم وجہ ان لفافوں کی امید تھی جو ان میں تھوڑی دیر بعد تقسیم ہونے والے تھے۔

پریس کانفرنس کے خاتمے پر دو تین مرکزی شخصیات نے ملک صاحب کو فون کر کے مبارکباد دی تھی۔

○

صبح کے اخبارات نے اس پریس کانفرنس کو نمایاں کوریج دی تھی۔ گو کہ سیکورٹی ایجنسیوں نے وزیر اعلیٰ کو اس کانفرنس کی ساری رپورٹ رات ہی کو پہنچا دی تھی، لیکن ابھی تک صوبائی لیگ کے لوگوں کو شاید ”سیاسی سانحے“ کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

صوبائی قیادت یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ملک صاحب جیسا ان کا خاص آدمی بھی ایک

ابھی الیکشن کا اعلان نہیں ہوا تھا اور ان سیاسی بندروں نے بندر بانٹ شروع کر دی

تھی۔

ان کی موجودگی ہی میں یہ اطلاع بھی مل گئی کہ ملک صاحب نے دارالحکومت میں ایک پرہجوم پریس کانفرنس کے دوران مرکزی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا ہے۔

○

”بڑی مشکل سے قابو آئی کجنت۔ دس ہزار دے کر بھی جان چھڑانی مشکل تھی۔ آپ جانتی ہیں مسز ملک کہ یہ کچر لوگ اتنی جلدی بے وقوف بننے والے تو نہیں۔“ ارسلان نے نمبر ملک کو دوسرے روز اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی۔

”پروانہ کرو۔ معمولی بات کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تم اسے بھول جاؤ۔ لعنت بھیجو۔ صرف مستقبل پر نظر رکھو ارسلان۔ ماضی کی بات کمزور لوگ کرتے ہیں۔ حال کو اپنا بنانا اور مستقبل کو اپنے قابو میں رکھنے کی فکر کرو۔ جو کام ہم نے اس طوائف سے لینا تھا وہ سے لیا۔ اب وہ بیکار ہے۔ ملک نے مرکزی پارٹی سے سودا بازی کر لی ہے۔ ہم چاہیں تو صوبائی لیگ سے اتنی بڑی ڈیل کر سکتے ہیں کہ ملک کے لئے سوائے ملک چھوڑ کر بھاگنے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا اور یہی میں چاہتی ہوں۔“ اس نے آخری فقرہ بڑا چبا کر کہا تھا۔ ”میں اس کو بھگا بھگا کر مار دوں گی۔“

ارسلان کو اس کی آواز میں چھپے قہر کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ”وہ تصویر کم از کم دکھا تو دیجئے۔“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ دیا۔

”فضول۔ بالکل فضول بات ہے یہ۔ تمہیں اس سے کیا لینا دینا۔ 50 ہزار تمہیں اس کا مل گیا..... حالانکہ جو جر بہ میرے کہنے پر تم نے اس طوائف پر اپنایا ہے وہی میں تم پر بھی استعمال کر سکتی تھی۔“

اس کی بات نے ارسلان کو لرزاکر رکھ دیا۔ نمبرہ نگم کے ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ چمکی ہوئی تھی اور اس سانولے رنگ کی خوبصورت ڈائن کا یہ روپ ارسلان کی رگ رگ میں خوف بن کر شرایت کر گیا۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ یہ عورت اس کے تصورات سے بڑھ کر خطرناک ہے۔ واقعی وہ کسی بھی لمحے کچھ بھی کر سکتی تھی..... ملک کی تصاویر حاصل کر کے اس نے ملک کو زندہ درگور کر دیا تھا

افسوس پارٹی نے ہماری آواز پر کبھی کان ہی نہیں دھرے۔ جناب والا! یہ آفر تو میرے پاس گزشتہ تین ماہ سے پڑی ہے۔ مرکزی پارٹی والے مجھے اپنی مرضی کی دو وزارتیں مرکز میں دے رہے تھے اور صوبے کے معاملے میں تو سب کچھ ہم پر چھوڑ دیا تھا لیکن ہم خاندانی لوگ ہیں..... ہم نے کبھی گھٹیا سیاست کا تصور بھی نہیں کیا۔ سو چاہتے ہیں کہ ہم کبھی اتنا بھی کر سکتے ہیں۔“ یہ بات کہتے ہوئے بھنڈر دل ہی دل میں خود پر لعنت بھیج رہا تھا کہ اس نے اب تک مرکزی پارٹی سے رابطہ کیوں نہ کیا اور ملک کو ایک مرتبہ پھر کیوں نمبر لے جانے کا موقع دے دیا۔

”بھنڈر صاحب! اقتدار تو آنی جانی شے ہے۔ سیاست میں بے اصولی کو عوام کبھی پسند نہیں کرتے۔ آپ دیکھیں گے کہ ملک صاحب ایک روز معافی مانگ کر واپس آئیں گے۔ یوں بھی ابھی تک انہوں نے کوئی اعلان نہیں کیا دوسری پارٹی میں شامل ہونے کا۔ ابھی ہم کوئی رائے کیسے قائم کر سکتے ہیں۔“ وزیر اعلیٰ نے انتہائی منافقت سے کام لیتے ہوئے خود کو اب بھی غیر جانبدار رکھنے کی کوشش کی۔

”جناب والا! اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ اعلان بھی وہ آج کل میں کر دے گا۔ وہاں دارالحکومت میں وہ کوئی لڑکے کا چھوہارہ تو ڈالنے نہیں گیا۔“ اس نے آج پہلی مرتبہ اس جرات سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

وزیر اعلیٰ نے ایک ٹاپے کے لئے اس کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ملک کی موجودگی میں بھیگی ملی بن کر بیٹھا رہتا تھا۔

”بھنڈر صاحب! پارٹیاں اپنے پروگرام کے بل پر چلا کرتی ہیں۔ عوام انہیں لوگوں کو اپنے نمائندے منتخب کریں گے جو ان کے دکھ درد کو جانتے ہوں۔ ان کا مدد ابھی کر سکیں۔ میری آپ ایسے سینئر لوگوں سے یہی درخواست ہے کہ آپ سب لوگ اپنے آپس کے اختلافات ختم کریں اور اس مرتبہ بل کر پوری ہمت سے انتخابی میدان میں اتریں۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہم نے ملک صاحب جیسے لوگوں کی نہ کبھی پہلے پروا کی تھی نہ اب کریں گے۔“

وزیر اعلیٰ نے دو تین ایسی ہی باتیں کر کے بھنڈر کو خوش کر دیا۔ ان کے درمیان تانتے کی میز پر یہ بات طے پا گئی تھی کہ صوبے میں کامیابی کی صورت میں تین اور مرکز میں کامیابی کی صورت میں دو وزارتیں بھنڈر گر وپ کی مرضی کے مطابق تقسیم کی جائیں گی۔

نکالی۔

”اچھا! اب یہ بھی مجھے ہی بتانا ہوگا۔“ سر پر تو لیے سے اس نے بالوں کو سکھاتے ہوئے

کہا۔

”مسز ملک! آپ نے یہ.....“ ارسلان لکے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”میں ابھی نہیں چاہتی تھی کہ تم یہ سب کچھ دیکھو لیکن اچھا ہوا بروقت آگاہ ہونگے تم۔“

یہ بہت ضروری تھا ارسلان۔ دیکھو بھی! انسانی فطرت بھی بڑی عجیب ہے۔ ایک بل میں جانے انسان کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ کیا کر بیٹھے اس کی سوچ کیا ہو جائے۔ ماضی کے تلخ تجربات نے مجھے تو بہت حقیقت پسند اور احتیاط پسند بھی بنا دیا ہے۔ تم بہر حال سیاسی آدمی ہو اور ظاہر ہے میں نے بھی اس میدان میں جھک ماری ہے۔ جانے کل تم کیا کر بیٹھو۔ جیسے میرا کوئی اہم راز تمہارے پاس محفوظ ہے اسی طرح تمہاری بھی کوئی کمزوری میرے پاس محفوظ ہونی چاہئے تاکہ مستقبل میں ہم ایک دوسرے کے خطرات پیدا نہ کر سکیں۔ تم نہیں جانتے ارسلان انسان کمینگی پر اتر آئے تو کتنا گر جاتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ ملک صاحب نے مجھے کتنی عزت دے رکھی ہے۔ اپنی اولاد تک سے مائل توڑ رکھا ہے میرے لئے، لیکن میں نے انہیں بھی بلیک میل کرنے کے لئے ”سٹف“ محفوظ کر لیا ہے حالانکہ وہ میرے مجازی خدا بھی ہیں اور میری مرضی اور منشا کا پورا پورا احترام بھی کرتے ہیں، لیکن اس خوف سے کہ جانے کل کوئی عورت انہیں مجھ سے زیادہ پسند آ جائے اور وہ..... بہر حال اپنا مستقبل محفوظ رکھنے کا..... حق تو سب کو حاصل ہونا چاہئے۔ میں سوچتی ہوں ارسلان اگر میرے جیسی پڑھی لکھی عورت بھی اتنی کمینگی کا مظاہرہ کر سکتی ہے تو اور کوئی کیسے نہیں کرے گی.....؟“

ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ عورت پاگل ہے یا اسے پاگل بنا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ اتنی اذیت پسند عورت اس نے زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ یوں اطمینان سے اپنا فلسفہ بگھا رہی تھی جیسے کلاس روم میں کوئی استاد اپنے سٹوڈنٹس کو لیکچر دے رہا ہو۔

”آپ نے بجا فرمایا مسز ملک۔ انسان کمینگی پر اتر آئے تو کتنا گر سکتا ہے۔ ویل ڈن! بہت اچھا کیا آپ نے کہ کھیل کے آغاز ہی میں اس کے اصول بھی بتا دیئے۔“ ارسلان کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔

اور ارسلان کے ذریعے یہ کارنامہ کروا کر اس نے ارسلان کو اپنے لئے دم ہلانے والا کتابنا کر رکھ دیا تھا۔

”اف میرے خدایا!“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں.....!“

”خیر چھوڑو۔ کس چکر میں پڑ گئے۔ میں ذرا باتھ لے لوں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ آج مجھے دو اہم تقاریب میں شامل ہونا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف چل دی۔

ارسلان بالکل لاشعوری انداز میں چلتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ اس کے دماغ میں ابھی تک نجمہ بیگم کا وہ فقرہ گونج پیدا کر رہا تھا۔ کمرے میں چھوٹی سی میز پر کل کی ڈاک رکھی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق ڈاک چیک کرنا شروع کر دی جب اچانک ہی تصاویر کا ایک لفافہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔

لاشعوری طور پر ہی اس نے اپنی چھٹی حس کے کہنے پر لفافہ میں سے تصاویر نکالیں۔ یہ اس کے دورہ انگلستان کی تصاویر تھیں۔ اچانک ہی ایک تصویر نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ اسے یاد آ گیا جب وہ فرینکفرٹ میں اپنا بریف کیس سجاد خان کے حوالے کر رہا تھا۔ اگر یہ تصویر انٹر پول یا مقامی پولیس کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کی ساری زندگی جیل کی سلاخوں کی نذر ہو جاتی۔ کیونکہ اس تصویر میں وہ سجاد خان سے بریف کیس وصول کرتا صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ سجاد کے ساتھ جو آدمی نظر آ رہا ہے وہ بھی یقیناً کوئی بین الاقوامی سمگلر ہو گا۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ تصویر کو دیکھ رہا تھا جب اچانک ہی اس کے پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ ارسلان نے کسی میکائیکی عمل کے تحت گردن گھمائی۔ مسز ملک اس کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ تصاویر کا لفافہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔

○

”گھبرا گئے کیا؟“

بیگم نجمہ نے کمال بے اعتنائی سے کہا۔

”یہ..... یہ کیا ہے؟“ ارسلان نے غصے اور حیرت سے ملی جلی آواز بمشکل حلق سے

ملک صاحب اور مسز ملک نے اس کی مصومیت کا خون کیا تھا۔ دونوں قاتل تھے۔
ارسلان عزیز ولد محمد عزیز قوم جٹ سکنہ چک انہتر کے قاتل۔
ان لوگوں نے ارسلان سے اس کی شناخت چھین لی تھی۔

اسے درندہ بنانے پر قتل گئے تھے۔

اس کا گھربار، خویش قبیلہ، سگی، ساتھی، لڑکپن، جوانی، کچھ بھی تو اس کا نہیں رہا تھا۔ اسے یاد آ گیا۔ باپ نے مرنے سے پہلے لکھ دیا تھا۔ اخبارات میں شائع کروادیا تھا:

”ہر گاہ کہ سمس ارسلان عزیز جو کہ میرا حقیقی پسر ہے، میرا نافرمان ہو چکا

ہے۔ میں اسے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ اس

کے کسی لین دین کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ میرا میرے دیگر خاندان کا اس

سے کوئی تعلق نہ ہے۔“

جانے آج اسے رہ کر ساری بھولی بری باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں۔ تب تو اسے اشتہار پڑھ کر غصہ آیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ اب جیتے جی وہ کبھی اپنے باپ کا منہ نہیں دیکھے گا۔

لیکن.....!!

اس روز جب اچانک کچھ دیر کے لئے اس کا ضمیر جاگا اور اس نے چاہا کہ باپ سے معافی مانگ لے تو گاؤں کے چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر ہی اسے علم ہو گیا کہ محمد عزیز ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ریلوے کا انتقال ہو چکا ہے۔

اس کے باپ کو مرے ہوئے تو تین ماہ ہو چکے تھے۔

کیسا غیر متندان انسان تھا اس کا باپ!

کیسا شاندار عہد نبھایا تھا اس نے!

واقعی جیتے جی اس نے ارسلان کا چہرہ نہ دیکھا۔

”ارسلان تم پر لعنت ہو۔ خدا تمہیں ذلیل و خوار کرے۔ دفع ہو جاؤ۔ تمہاری سزا یہی ہے کہ تمہیں معافی نہیں مل سکتی۔ میں تمہیں اپنے دودھ کی دھاریں کبھی نہیں بخشوں گی۔ تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ نکل جاؤ، دفع ہو جاؤ۔ لعنتی! تم راندہ درگاہ ہو۔ تم نے اس شخص کی جان لے

”یہ میرا فرض تھا ارسلان۔ آخر تم دھوکے میں کیوں مارے جاؤ۔ کیوں نہ تمہیں پہلے ہی سے تمام ”روٹری اینڈ ریگولیشنز“ سے آگاہ کر دیا جائے.....!“ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

اور.....!

ارسلان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کا ٹینو ادا باکر اسے مار ڈالے.....!

”مسز ملک کیا آپ ان ذات شریف کا تعارف کروانا پسند فرمائیں گی۔“ اس نے

اپنے اور سجاد خان کے درمیان کھڑے ایک انگریز کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ تصویر اس نے زمین سے اٹھالی تھی۔

”جیفری..... جیفری ہاؤ۔ خدا جانے اس کا اصل نام ہے یا نہیں لیکن کجنت نے نام بڑا

زبردست اپنایا ہے۔ انٹر پول کے پاس اس کا مکمل ریکارڈ اس تصویر کے ساتھ موجود ہے۔ عام

حالت میں یہ اس حلیے میں نہیں رہتا..... صرف تمہارے لئے بچا رہا اتنا خطرہ مول لے کر اس روپ

میں تھوڑی دیر کے لئے سامنے آیا تھا..... اصل میں ارسلان یہ بہت ضروری تھا۔ اس طرح کبھی

پولیس کو یہ یقین نہیں دلایا جاسکتا کہ تصویر نقلی ہے اور تمہیں پھنسانے کے لئے بنائی گئی ہے اور یہ ہے

بھی ایمانداری کی بات کہ تصویر بہر حال اصلی ہے۔“ آخری فقرے پر اس نے اذیت ناک ہتھکڑی

بھی لگایا تھا۔ ”خیر لعنت بھیجوان تصویروں میں کیا رکھا ہے۔ چلو مجھے شام کو پھر پریس کانفرنس سے

خطاب کرنا ہے تیاری کرلو۔“

یہ کہتے ہوئے ارسلان کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہ باہر نکل گئی۔

اس نے ارسلان کو یہ نہیں کہا کہ وہ تصویریں یہیں رکھ دے..... یوں بھی نیکھو جانے

کہاں محفوظ تھے اور ان کی ہزاروں کاپیاں تیار کی جاسکتی تھیں۔

○

اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے اسے آج نجانے کیوں ہمارا اکبر علی ٹوٹ کر یاد آئی۔ ہمارا

اکبر شیروانی نے اس سے کہا تھا کہ جس دنیا میں وہ داخل ہو گیا ہے اس سے باہر جانے کا راستہ شاید

اسے کبھی نہ مل سکے۔ اس نے ارسلان سے کتنی منت ساجت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس دلدل

سے باہر نکل آئے کیونکہ جیسے جیسے آگے جائے گا دلدل اور گہری ہوتی جائے گی۔

تب وہ کتنا معصوم تھا.....!

صاحب کی داشتہ سے بیوی بن چکی تھی۔

اب یہ عورت اسے نچائے گی۔

اور وہ بندر کی طرح اس کی ڈگڈگی پر ناچے گا۔

”نہیں مسز ملک! نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ تم دو کوڑی کی عورت۔ تم

مجھے ارسلان عزیز جٹ کو اپنا بندہ بے دام بنانے چلی ہو۔ تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ میرا حسب

نسب کیا ہے..... میں تمہیں اوقات یاد دلا دوں گا نجمہ بیگم۔ کوئی بات نہیں آج اگر میری لگا میں

تقدیر نے تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں تو کیا ہوا۔ میں گدھا گاڑی میں بندھنے والا گدھا نہیں

ہوں۔ میں شہ زور منہ زور گھوڑا ہوں۔ تمہیں کس نے حق دیا ہے میری پیٹھ پر سواری کرنے کا؟“

جانے وہ عالم وحشت میں کیا کیا خواب دیکھتا رہا۔

جانے وہ کب تک دشت اتا میں بھٹکتا رہا۔

کہ اچانک اس کی پشت پر نجمہ ملک کی آواز بلند ہوئی۔

”ارسلان چلو! دیر ہو رہی ہے۔“

”ہاں دیر ہو گئی مسز ملک..... ہمیں چلنا چاہئے۔“ اس نے مڑتے ہوئے کہا۔

نجمہ کی زمانہ ساز نظروں نے اس کے اندر دور تک جھانک کر دیکھ لیا تھا کہ گھوڑا بے لگام

ہونے جا رہا ہے۔

”بے چارہ!“ وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔

○
ملک صاحب کی سرکاری لیگ میں شمولیت کوئی معمولی خبر نہیں تھی۔

انقلابی سٹوڈنٹس فیڈریشن دو واضح دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک دھڑا جس کی قیادت

نوید گروپ کر رہا تھا، ملک صاحب کے ساتھ تھا جبکہ دوسرا گروپ جس کی قیادت گجر کے ہاتھ تھی

ابھی تک صوبائی لیگ سے جڑا تھا۔

ملک کو پہلے ہی سے امید تھی کہ گجر شاید اس کے قابو نہ آ سکے کیونکہ وہ اپنی قسم کا نوجوان

تھا۔ آج تک ملک صاحب کو اس نے کبھی تھانے پکھری کی زحمت نہیں دی تھی۔ یہ تو ملک صاحب

پر بہت دیر بعد منکشف ہوا کہ اصل میں گجر کو بھنڈر کی پشت پناہی حاصل تھی۔

لی جس کے وجود سے اس گھر کے اینٹ پتھر سانس لیا کرتے تھے۔ وہ زندہ تھا تو ہم سب بھی زندہ

تھے۔ تم ہم سب کے قاتل ہو۔ چلے جاؤ اس سے پہلے کہ میری نسلی غیرت جاگ اٹھے اور میں اپنے

مجازی خدا کے قاتل کی جان لے لوں..... چلے جاؤ..... نکل جاؤ.....!“

اس کی ماں نے اس کی شکل پر تھوک کر گھر کا دروازہ اس پر بند کر دیا تھا۔ اس پر لعنت بھیج

کر اس سے ناطہ توڑ لیا تھا۔

”ماں اتنی ظالم نہیں ہوتی۔“ اس روز اسٹیشن کی طرف لوٹتے ہوئے ارسلان نے

سوچا۔

”شاید یہ میری ماں ہی نہیں۔ شاید مرنے والا میرا باپ ہی نہیں تھا۔ شاید میرا کبھی کوئی

وجود ہی نہیں رہا۔ شاید میں ارسلان عزیز جٹ کبھی تھا ہی نہیں۔“

یہ کوڑھ زدہ وجود والا شخص جس کا سایہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے جانے کون ہے؟

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے الوداعی نظران کھیتوں اور کچے راستوں پر ڈالی جہاں

قدم قدم پر اس کی مصیبت بکھری پڑی تھی۔ جہاں اس کا بچپن سکیاں لے رہا تھا۔ اس زمین

میں اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ جانے شہر کے ظالم لوگوں نے اس پر کیا سحر پھونک دیا تھا کہ

ارسلان عزیز نے اپنی جڑوں پر خود ہی کھانا اچالا۔

اسے سمجھ نہ آ سکی کہ جس مقدس زمین سے اس کا رشتہ جڑا تھا اس نے ارسلان کے کینسر

زدہ وجود کو خود سے کاٹ کر اس لئے پھینک دیا تھا کہ کہیں اس کا زہر ساری زمین میں سرایت نہ کر

جائے۔

اس کا سیم تھوڑا زہر وجود اس مٹی کو بانجھ کر ڈالتا۔

لیکن.....!!

اس کے بہادر باپ نے زمین کی آبرو بچالی۔ اس نے اپنی زمین کی ہر پالی کو موت نہیں

آنے دی۔ اپنے وجود کے کینسر زدہ حصے کو کاٹ کر پھینک دیا۔

توبہ کے سارے دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے گئے۔ آج اسے پہلی مرتبہ

احساس ہوا کہ وہ تو حالات کے ہاتھوں میں اپنی بد اعمالیوں کے سبب کھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔

یہ سانولی سی..... کسی کین گھرانے کی فاحشہ عورت جو اپنی حرام کاری کے ہاتھوں ملک

ہٹانے کا مطلب تھا ایک شاندار فتح.....!!

اور اس شاندار فتح کے تصور میں سرشار صوبائی لیگ کی لیڈر شپ اب بھنڈر کی ڈگڈگی پر بالکل اسی طرح ناچ رہی تھی جس طرح کبھی وہ لوگ ملک کی ڈگڈگی پر ناچا کرتے تھے۔ بھنڈر نے پارٹی فنڈ کو ”حلوائی کی دکان اور ناناجی کی فاتحہ“ میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ آئے روز کوئی نہ کوئی کارروائی ڈال کر فنڈ زاپے قبضے میں کر رہا تھا اور صوبائی لیگ کی قیادت آنے والے انتخابات سے خوفزدہ اس کے اگلے سیدھے مطالبات پورے کرتی رہی۔

نہلے پہلے دھلا

نیشن چوک پر دیگن شینڈ سے پہلے ارسلان گروپ کے لوگ براہ راست غنڈہ ٹیکس وصول کیا کرتے تھے اور دیگن ساکان ہر مہینے ایک لگی بندھی رقم ان کے ہیڈ آفس میں پہنچا دیتے تھے۔ ایک دوسرے انہوں نے مقامی بد معاشوں کی خدمات بھی حاصل کیں کہ کسی طرح ان لوٹوں سے جان چھوٹ جائے۔

لیکن ناکام رہے.....!!

اڑے کی حد تک تو مقامی بد معاشوں نے فائرنگ کر کے انقلابی تنظیم کے ”جکوں“ کو بھگا دیا لیکن دیکھو کے روٹ بہر حال کالجوں کے سامنے سے گزرتے تھے اور کالجوں کی سامنے

اور.....!!

یہ بھنڈر ہی تھا جس نے کبھی گجر کے نزدیک پولیس کو پھٹکنے ہی نہیں دیا تھا۔ پہلے تو ملک نے یہی چاہا کہ اپنے ”بالکوں“ کی ایک پریس کانفرنس بلا کر گجر پر سنگین الزامات کی فہرست جاری کروائے اور اس کی چھٹی کروادے۔ لیکن.....!!

وہ صرف سوچ سکتا تھا۔ یہ کڑوا گھونٹ تو اسے بہر حال بھرنا ہی تھا کیونکہ فیڈریشن کے کھاتے میں وہ صوبائی لیگ سے اچھا خاصا ”خرچہ“ بٹور سکتا تھا۔ یہ تو اس کی اپنی لیاقت تھی کہ اس نے ذاتی اثر و رسوخ نو جوانوں میں اتنا پیدا کر لیا تھا کہ اب وہ اور انقلابی فیڈریشن لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ ورنہ تنظیمی طور پر اس کا فیڈریشن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ صوبائی لیگ کی شروع ہی سے یہی پالیسی رہی تھی کہ فیڈریشن سے براہ راست کوئی تعلق کبھی نہ رکھا جائے۔ لیکن درپردہ اس کی مکمل پشت پناہی کی جائے۔ کیونکہ مرجعہ سیاست میں لوگ نو جوانوں کی اہمیت کا بخوبی ادراک رکھتے تھے۔

انہیں علم تھا کہ سیاسی غنڈہ گردی کے بغیر سیاست اور سیاست دانوں کی حیثیت وہی ہے جو کسی بھی محلے میں رہنے والے ایک شریف شہری کی ہوا کرتی ہے۔ جس پر محلے کے بد معاش سے لے کر علاقے کا تھانے دار تک رعب ڈال سکتا ہے۔

○

بھنڈر کو اب وزیر اعلیٰ کی مکمل آشریاد حاصل ہو چکی تھی۔

اس نے اپنی ماضی کی خدمات کے حوالے دے دے کر سٹوڈنٹس ونگ کا چارج سنبھال لیا تھا اور وزیر اعلیٰ کو یقین دلادیا تھا کہ چند ہفتوں کے اندر ہی اندر وہ ملک صاحب کو چھٹی کا دودھ یاد دلادے گا۔

وزیر اعلیٰ نے بھی یہ سوچ کر ”سانپ کو سانپ لڑے تو زہر کس کو چڑھے“ بھنڈر کی باگیں کھلی چھوڑ دیں۔ وہ بھی اس بات کو سمجھتے تھے کہ اصل میں بھنڈر کا ٹارگٹ ملک کی ذات ہے۔ اگر بھنڈر ملک کو نچا دکھانے میں کامیابی حاصل کر لیتا تو یہ صوبائی لیگ کی فتح تھی اور آنے والے انتخابات میں اس کے بہت مثبت نتائج برآمد ہوتے۔ صرف ملک کے سیاسی منظر سے

بات خلاف معمول تھی لیکن ارسلان سے مشورے کے بعد انہوں نے دو لڑکوں کو بھیج دیا۔ ویگن اڑے والے جانے کب سے تاؤ کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دونوں ”ہرکاروں“ کو قابو کر لیا اور پہلے تو مار مار کر ان کا بھرکس نکالا۔ پھر پولیس کو ٹیلی فون کر دیا۔

○

پلان کے مطابق انہوں نے کلاشکوف اور ماؤزرسیت دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

ان کے خلاف غنڈہ گردی، فائرنگ اور زبردستی ٹیکس وصول کرنے کے الزامات لگائے گئے تھے۔ ان کا موٹر سائیکل ویگن والوں نے لوہے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔

جب پولیس ملزمان کو گرفتار کر کے لے جا رہی تھی، عین ان لمحات میں اخبارات کے فوٹو گرافرز اور رپورٹرز بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ لوگ بھنڈر صاحب کی خصوصی درخواست پر تشریف لائے تھے۔ انہوں نے موقعہ واردات پر ملزموں کی اسلحہ سمیت رکتے ہاتھوں گرفتاری کی تصاویر اور خبریں مقامی ڈرائیور یونین کے نمائندوں کے بیانات کے ساتھ اگلے روز کے اخبارات میں نمایاں کر کے شائع کی تھیں۔

ویگن والوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر پولیس نے ملزموں کے ساتھیوں کو گرفتار نہ کیا جو بقول ان کے موقعہ واردات سے فرار ہو گئے تھے اور آئندہ اگر کسی ویگن پر حملہ کیا گیا تو وہ پیہ پیہ جام ہڑتال کر دیں گے اور ان حالات کی ذمہ داری پھر سرسرا نظامیہ پر ہوگی۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق گرفتار شدگان کی طرف سے پولیس نے بیان جاری کیا تھا کہ ان کا تعلق طلباء تنظیم کے نوید گروپ سے ہے اور انہیں مرکزی لیگ کے بعض لیڈروں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ایس ایس پی صاحب نے پولیس کانفرنس میں ان شخصیات کے نام صیغہ راز میں رکھے تھے جن کی پشت پناہی ان غنڈہ عناصر کو حاصل رہی تھی۔

○

ملک کے سامنے اخبارات پھیلے ہوئے تھے.....!

یوں تو اسے ”اپنے بندوں“ سے جو اخبارات میں موجود تھے، خبر کی اشاعت سے پہلے ہی اس بات کا علم ہو گیا تھا، لیکن اس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ ملک جانتا تھا کہ فی الوقت

والی سڑکوں پر جب طلباء نے دو تین دیکھیں تو نقصان پہنچایا تو مالکان نے پھر ان سے صلح کر لی۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ اس ضمن میں نہ تو پولیس ان کی مدد کر سکتی ہے نہ کوئی اور۔ جانے کتنی مرتبہ انہوں نے اعلیٰ افسران سے رابطے کئے اور ان کے نازخروے اٹھائے تھے لیکن ہنڈیا سرے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

جس روز انقلابی طلباء تنظیم دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو ویگن مالکان کے لئے گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اس سے پہلے وہ نوید گروپ سے ہی زیادہ ڈیل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے پولیس کانفرنس کے اگلے ہی دن گجر گروپ سے ملاقات کی اور انہیں مقررہ سے آدمی رقم ماہوار وصول کرنے پر رضامند کر لیا۔ گجر گروپ کی طرف سے انہیں اس بات کی ضمانت دے دی گئی کہ ان کی دیکھیں بہر صورت محفوظ رہیں گی اور نوید گروپ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

ویگن مالکان کی یونین کے نمائندوں نے گجر گروپ سے رابطہ بھنڈر صاحب کے ذریعے کیا تھا اور یقین دہانی کروادی تھی کہ وہ ہر ماہ ایمانداری سے رقم بھنڈر صاحب کے کسی بھی مقررہ نمائندے کے حوالے کر دیا کریں گے۔

بھنڈر بھی ملک کے دانت دیکھنا چاہتا تھا۔

یہ بہترین موقعہ تھا اس کے لئے اپنے جانباڑوں کی صلاحیتیں آزمانے کا۔

اس نے گجر سے کہہ دیا تھا کہ بھلے وہ لوگ تعداد میں کم ہیں، لیکن صوبے میں ان کی بادشاہت ہے اور بادشاہت بھی ایسی کہ چڑیا پر نہیں مار سکتی۔ اس لئے گجرات کی کوئی بات نہیں۔

”میں نے آئی جی سے کہہ دیا ہے اپنا بندہ ہے۔ بس ذرا بچا کر کام کرنا اور ہاں زیادہ..... منہ مارنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دو بڑے کام کر لیا کرو۔ آئندہ مجھے کسی اخبار میں کم از کم دکانداروں کے ساتھ تمہارے لڑکوں کے لڑائی جھگڑے کی خبر نہیں ملنی چاہئے۔ ذرا میری پوزیشن کا بھی خیال رکھا کرو.....!“ اس نے گجر سے کہا۔

”بھنڈر صاحب! آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔ میں لڑکوں کو سمجھا دوں گا۔“ گجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تین چار روز بعد جب معمول کے مطابق نوید گروپ نے ویگن اڑے کے مالکان سے رابطہ کیا اور ماہانہ کا تقاضا کیا تو ان کی طرف سے اڑے پر آ کر رقم وصول کرنے کی ہدایت ملی۔ گویہ

انتظامیہ پر عائد ہوگی۔

انہوں نے صوبائی لیگ کے لیڈروں سے درخواست کی تھی کہ وہ طلباء کے معاملات میں مداخلت بند کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی ہوٹلوں اور کالجوں کو غیر طلباء عناصر سے پاک کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس پریس کانفرنس کے شرکاء نے صوبائی لیگ پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ درسگاہوں کا امن و امان تباہ کر کے انہیں سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

پریس کانفرنس کے خاتمے پر نوید اور اس کے ساتھی غائب ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب پولیس ان کو گرفتار کرنے کے لئے سرگرم ہوگی اور فی الوقت وہ پولیس کو گرفتاری نہیں دینا چاہتے تھے۔

پریس کانفرنس میں انقلابی طلباء تنظیم کی دھمکیاں اعلیٰ قیادت کو پہنچادی گئی تھیں جہاں سے پولیس کو ہدایت کی گئی تھی کہ ان دھمکیوں کو بالکل خاطر میں نہ لائے اور بلیک میلنگ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے۔

بھنڈر والی کانفرنس کی طرح ملک صاحب والی کانفرنس کی خبریں بھی اخبارات نے..... شہ سرخیوں سے شائع کیں لیکن ان کی وارننگ نظر انداز کر دی گئی اور اسی روز آئی جی نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ پولیس کسی کو امن و امان تباہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی اور اگر طلباء نے بھی خلاف قانون حرکت کی تو ان کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا اور چار سے زیادہ لوگوں کے اجتماع کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اسلحہ لے کر چلنے پر پابندی عائد کر دی۔ علی الصبح پولیس کی لاریوں نے پہلے ہی ان کالجوں کو گھیرے میں لے لیا تھا جہاں نوید گروپ کے لوگوں کی طرف سے شورش کا خطرہ تھا۔

حالات کے پل پل کی خبر ملک صاحب کو مل رہی تھی۔

اس وقت وہ مرکزی لیگ کے ایک وزیر کے گھر میں فروکش تھے جہاں مرکزی لیگ کا اہم اجلاس چل رہا تھا۔ اس اجلاس میں مقامی پارٹی یونٹوں کو فوری طور پر ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔ راتوں رات نزدیکی شہروں سے پارٹی کارکن اس شہر میں جمع ہونے لگے تھے۔ پارٹی کے جیالوں کو انقلابی طلباء تنظیم کی مدد کرنے کی خصوصی ہدایت جاری کر دی

وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ اخبارات میں خبر کو شائع ہونے سے روک دے۔

ارسلان نوید اور ان کے گروپ کے کچھ لوگ ملک صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں دو تین وہ بھی تھے جن کے گھروں پر پولیس چھاپے مار چکی تھی۔ ملک کو احساس تھا کہ یہ خطرناک کھیل کس نے کھیلا ہے۔ زندگی میں شاید پہلی مرتبہ بھنڈر نے اپنے دل کے پھپھو لے پھوڑے ہیں اور اسے ملک صاحب کو نیچا دکھانے کا موقع ملا تھا۔

”تم دونوں فی الحال ادھر ادھر ہو جاؤ۔“ اس نے دولڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں ہدایت کی۔ ”میں ذرا بھنڈر کے دانت دکھ لوں۔ ہماری پلی اور ہمیں کو میاؤں.....!“ غصے سے ملک کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔

اس نے فوری طور پر پریس کانفرنس کا بندوبست کیا تھا۔ اس پریس کانفرنس سے نوید اور ارسلان نے خطاب کرنا تھا، لیکن عین وقت پر مسز ملک کی خواہش پر ملک صاحب نے ارسلان کا نام واپس لے لیا۔

”ارسلان کو اب آہستہ آہستہ سٹوڈنٹس پالیٹکس سے نکال لو۔ میرے خیال سے یہی بہتر ہے۔“ نجمہ نے اسے کہا۔

ملک صاحب جانتے تھے کہ نجمہ ملک اسے لندن کا ایک چکر لگوا چکی ہے اور اس کے دھندے کی نوعیت سے بھی وہ واقف تھے۔ یوں بھی حالات آج کل ان کے لئے سازگار نہیں تھے اور وہ اپنی ہزیمت کے تمام بدلے کسی آنے والے وقت پر اٹھا رکھنا چاہتے تھے۔

نجمہ ملک جانتی تھی کہ اب صوبائی لیگ ایک ایک کر کے ملک کی کمزور نینٹوں کو دبائے گی اور ایک روز وہ ارسلان کو بھی گرفتار کر لیں گے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارسلان گرفتار ہو۔ اس نے ارسلان کو اس ”گندے کھیل“ سے نکال کر ”بڑے کھیل“ کا کھلاڑی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نوید اور اس کے ساتھیوں نے پریس کانفرنس میں صوبائی لیگ پر جوابی الزامات عائد کرتے ہوئے کہا کہ صوبائی لیگ نے ان کو رسوا کرنے کے لئے یہ گھٹیا ہتھکنڈہ استعمال کیا ہے اور ان کے دوستوں کو جو کسی کام سے جا رہے تھے راستے سے اغوا کر کے دیگن اڈے پر پہنچایا گیا جس کے بعد ان پر جھوٹے الزامات لگا کر انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ انہوں نے پولیس کو وارننگ دی تھی کہ اگر چوبیس گھنٹے میں ان کے دونوں ساتھیوں کو رہا نہ کیا گیا تو حالات کی ذمہ داری مقامی

بھنڈر جیسے گدھے ہمیں سیاست پر حانے لگیں ہمارے لئے تو پھر اس ملک میں کوئی جگہ باقی نہ رہی
تاں..... ہمیں تو پھر شاید سیاست ہی کو خیر باد کہنا پڑے گا۔“

○

مرکزی لیگ کے کھل کر سامنے آنے پر صوبائی قیادت نے ایک مرتبہ تو ہتھیار ڈالنے کا
فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اس مرحلے پر طلباء کے ہنگامے جب کہ انہیں مرکزی لیگ کی پشت پناہی بھی
حاصل ہوتی، صوبے کے لئے کوئی نیک شگون نہیں تھے۔
لیکن.....!

بھنڈر گر روپ اپنا دباؤ برابر بڑھا رہا تھا۔

انہوں نے سیاسی قیادت کو باور کروادیا تھا کہ اگر انہوں نے پہلے ہی حملے میں ہتھیار
پھینک دیئے تو شاید اگلے الیکشن پر انہیں تکلیفیں بانٹنے کے لئے ڈھنگ کے امیدوار ہی نہ مل سکیں۔
اس نے اس لڑائی کو اپنی اور ملک کی ذاتی جنگ میں بدل دیا تھا اور وہ صوبے کے امن و
امان کی بحیثیت دے کر بھی اس جنگ میں فتح حاصل کرنا چاہتا تھا۔

صوبائی قیادت کو احساس تھا کہ بھنڈر کے ساتھ ایک مضبوط پریشگر روپ موجود ہے اور
وہی ایک ایسی شخصیت ہے جو مستقبل میں شاید ملک کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر سکے۔

بادل نخواستہ انہیں مضبوط شیڈیل لینا پڑا۔

آئی جی کا پولیس کو حکم جاری ہو گیا کہ ہنگامہ آرائی کی صورت میں پولیس فورس کو
استعمال کر کے سختی سے ہنگامہ پھیل دیا جائے کیونکہ وزیر اعلیٰ صاحب کسی کو بھی قانون اپنے ہاتھوں
میں لینے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے.....!

اندر کی ایک ایک خبر ملک کو ”اپنے بندوں“ کے ذریعے مل رہی تھی۔ اس نے اپنے
”گوریلوں“ کو آخری ہدایات جاری کیں اور مرکزی وزیر کے ساتھ ”ٹائٹ کوچ“ سے
دارالحکومت روانہ ہو گیا۔

○

اگلے ہی روز ملک صاحب کے گوریلوں کی حرکت میں آ گئے۔

ہنگاموں کا آغاز مقامی کالج کے سامنے ایک دیگن کو روک کر نذر آتش کرنے سے

گئی تھی۔ انہیں ان کے کام سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ میٹنگ درخواست ہو گئی۔

24 گھنٹے گزر گئے.....!

اس دوران پولیس نے دونوں مجرموں کو روکنا کیا کرنا تھا۔ ان کی ”نشاندہی“ پر ان کے
دس بارہ اور ساتھی دھر لئے۔ نوید ملک کے بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے لیکن وہ مفروضہ تھا۔
24 گھنٹے مکمل ہونے پر مرکزی لیگ کی طرف سے ایک ہنگامی پریس کانفرنس کا انعقاد
ہوا۔ جس سے مرکزی لیگ کے صوبائی صدر نے خطاب کیا اور صوبائی حکومت سے درخواست کی گئی
کہ وہ امن عامہ کو تباہ کرنے سے احتراز برتے۔

ملکی محذو ش حالات اور بین الاقوامی صورت حال کی طرف اشارہ کر کے صوبائی حکومت
سے درخواست کی گئی کہ اس مرحلے پر وہ طلباء کو مشتعل نہ کریں اور نہ ہی انہیں اپنے سیاسی مقاصد
کے لئے آلہ کار بنائیں۔ اس پریس کانفرنس میں ایک ٹرانسپورٹ یونین کے صدر صاحب بھی
تشریف فرما تھے۔ جنہوں نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ انہیں طلباء سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی
کیونکہ طلباء اس قوم کا مستقبل ہیں اور مستقبل کی حفاظت کرنا ان سب کی ذمہ داری ہے۔ انہوں
نے کہا کہ طلباء کی آڑ میں کچھ غنڈہ عناصر اگر دیگن والوں کو تنگ کرتے ہیں تو اس کے لئے ساری
طلباء برادری کو مورد الزام ٹھہرانا سراسر زیادتی ہے۔

صدر صاحب نے مقامی و لیکن ڈرائیور یونین کو خود ساختہ اور پولیس کے ٹاؤٹ قرار
دیتے ہوئے اخبار نویسوں کو یقین دہانی کروائی کہ ٹریفک کا پیہہ جام کرنے والوں کی کوئی حیثیت
نہیں اور وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے مرکزی ٹرانسپورٹ یونین کی طرف سے عوام
کو بھی یقین دہانی کروائی کہ ان کے ہوتے ہوئے عوام کو کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ صدر
صاحب نے طلباء سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنی صفوں میں موجود غیر طلباء اور غنڈہ عناصر کو نکال باہر
کریں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔ انہوں نے پولیس سے طلباء کو روکنا کرنے کی اپیل کی تھی۔

ملک صاحب اپنا ایک ایک مہرہ بڑی کامیابی سے آگے بڑھا رہے تھے۔

”شطرنج کے کھیل کا مزہ ہی تب آتا ہے جب مقابل بھی کم از کم اپنے پائے کا کھلاڑی

ہو۔“

انہوں نے مرکزی وزیر صاحب کے سامنے ہتھیار لگاتے ہوئے کہا۔ ”سائیں! اگر

اس دوران ایک افسوسناک واقعہ بھی ہو گیا۔ جب پولیس کی جوابی فائرنگ سے ایک بے گناہ طالب علم جو اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہا تھا مارا گیا.....!!

مرنے والا اپنے والدین کی واحد اولاد زینہ تھی۔ وہ مقامی بارکونسل کے عہدے دار کا بیٹا تھا جس کے متعلق ہر شخص قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ اس نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ وہ شاندار تعلیمی کیریئر کا حامل نوجوان تھا اور مستقبل کا ڈاکٹر.....!

پولیس کا موقف تھا کہ اسے گولی پولیس نے نہیں ماری بلکہ وہ طلباء کی فائرنگ سے ہی مرا ہے۔

لیکن.....!!

وہاں پولیس کی بات کا یقین کون کرتا؟ اخبار نویسوں نے پولیس کے اندھا دھند لاشی چارج کی تصاویر اتاری تھیں۔ ایک ڈی ایس پی صاحب نے جب اپنی پولیس افسری کی دھونس میں ایک اخبار کے نوٹو گرافر سے گالی گلوچ کی تو وہ بھی مقابلے پر ڈٹ گیا جس پر پولیس نے اسے بھی ڈنڈوں کی زد پر لے لیا۔ بے چارے کا کیمرا ٹوٹ گیا۔ اس پر لاشیاں برساتے پولیس کے ”شیر دل جوانوں“ کی تصاویر دوسرے اخبار کے نوٹو گرافروں نے اتاری تھیں۔

ہر نوٹو گرافر سے کیمرا چھین کر توڑ ڈالنا پولیس کے بس سے باہر تھا۔ اس واقعے نے اخبار نویسوں میں پولیس کے خلاف جذبات مزید بھڑکادیے۔

○

شام ڈھلنے تک ہنگامہ قدرے فرو ہو گیا۔

رات گئے مقامی ایس ایس پی صاحب ایک ایک اخبار کے دفتر جا کر ڈی ایس پی کے سلوک کی معافی مانگتے رہے۔ انہوں نے فوری طور پر ڈی ایس پی کو معطل کر کے لائن حاضر کر دیا تھا۔ ایک دو اخبارات نے ان کی درخواست پر ”ہاتھ نرم“ رکھا۔

لیکن.....!!

ملک کے دو تین مقتدر اخبارات نے جن کے تعلقات مرکزی لیگ سے بھی خوشگوار تھے واقعات کی صحیح رپورٹنگ اور تصویر کشی کر دی۔ اخبار نویسوں پر پولیس کے لاشی چارج نے اخباری برادری کو الگ مشتعل کیا تھا۔ بے گناہ طلباء اور خصوصی مقامی بارکونسل کے عہدے دار کے ہونہار

ہوا۔ طلباء نے دیگن کی سواریوں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر جان بچا کر بھاگ گئے اور طلباء نے پولیس کی آنکھوں کے سامنے دیگن کو کنڈر آتش کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی دوسرے مقامی کالج کے طلباء حرکت میں آئے اور انہوں نے کالج کے سامنے موجود پولیس پر خشت باری شروع کر دی۔ نجانے ان لوگوں نے اتنے اینٹ پتھر کیسے کھاج کی چھت پر جمع کر لئے تھے۔ شاید وہ ایک عرصے سے اسی موقع کے منتظر تھے۔ جب پولیس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے طلباء پر آنسو گیس پھینکنی شروع کی تو کالج کی چھت سے پولیس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔

اس فائرنگ کرنے والے کو کسی نے نہیں دیکھا..... اس نے اپنا کام مکمل کیا۔ پولیس پر تین چار برسٹ مارے اور کالج کی چھت سے اتر کر چپ چاپ غائب ہو گیا۔

پولیس نے اس دوران جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔

جواب میں نوید گروپ کے طلباء بھی پولیس پر پستولوں سے گولیاں چلانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی مقامی مجسٹریٹ نے پولیس کو کالج میں داخل ہونے کا حکم دیا اور ڈنڈا بردار پولیس فائرنگ کی آڑ میں کالج میں داخل ہو گئی۔ پولیس کو کالج پر حملہ آور ہوتے دیکھ کر شریہند طلباء یوں غائب ہوئے جیسے انہیں زمین نگل گئی ہو۔ خدا جانے انہوں نے فرار کے لئے کون سا راستہ منتخب کر رکھا تھا۔

بے گناہ طلباء جو بے چارے اپنی کلاسوں میں منہ پر گیلیے رومال رکھے آنسو گیس کا عذاب بھگت رہے تھے۔ ان لوگوں نے فرار ہوتے ہی اپنی بچائیں بچانے کے لئے جیسے ہی کلاسوں سے باہر نکلے پولیس کے ڈنڈا بردار جیالوں کے قابو میں آ گئے۔

پولیس والے بھی جانب کب سے تاؤ کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے چند منٹوں میں ہی انہیں روٹی کے گالوں کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

پندرہ بیس: دھموئے طلباء کو اپنی لاری میں ٹھونس کر پولیس کا ایک گروپ حوالات کی طرف روانہ ہو گیا۔

○

بعینہ کہانی دوسرے دو مقامات پر دہرائی گئی.....!

بھاگ اٹھے۔ انہوں نے جنازہ وہیں سڑک پر رکھ دیا تھا۔ اب ایک اور ستم ظریفی ہوئی جب جلوس نے شہر کا رخ کیا۔ وہ تو ادھر ادھر کھڑے پولیس پر خشت باری کرنے لگے جب کہ غزدہ اور بے حال مقتول کے لواحقین اپنے بچے کی لاش اٹھانے کو آگے بڑھے اور پولیس نے ان پر ڈنڈا بازی شروع کر دی۔

اخبار نویسوں کے قلم اور کیمرے حرکت میں آئے اور ”بے گناہ مقتول طالب علم کے لواحقین پر پولیس کے وحشیانہ لاٹھی چارج“ کی تصاویر بننے لگیں.....!

پولیس اور ہجوم کی آنکھ پھولی دو تین گھنٹے جاری رہی۔ جس کے بعد مرحوم کو پولیس کی نگرانی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

○

اگلے روز کے اخبارات مقتول کے لواحقین پر پولیس کے لاٹھی چارج کی تصاویر کے ساتھ نئے وزیر اعلیٰ کے سامنے رکھے تھے جو بھنڈر کے ساتھ منہ لٹکائے میٹنگ میں بیٹھے تھے۔ اچانک ہی وزیر اعلیٰ کے خصوصی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے چیف سیکرٹری ان سے مخاطب تھا:

”جناب والا! آئی جی صاحب کو اسٹیلٹمنٹ ڈویژن نے واپس بلوایا ہے۔ ان کی خدمات ایک مرتبہ پھر مرکزی حکومت نے حاصل کر لی ہیں اور ان کی جگہ.....“

نوجوان وزیر اعلیٰ نے فون رکھ کر تازہ اطلاع وہاں موجود پارٹی لیڈروں تک منتقل کر دی۔

”مرکز براہ راست اس لڑائی میں کود پڑا.....!“ بھنڈر نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

”ہاں بھنڈر صاحب اور آپ کی مہربانی سے مرکز کو فی الوقت عوام کی ہمدردیاں بھی حاصل ہو گئی ہیں..... کیا خیال ہے آپ کا؟“

وزیر اعلیٰ کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔

”میرے خیال سے جناب والا ہمیں فی الوقت کوئی اہم فیصلہ کرنا ہے۔ ہم صوبے کے عوام کی ہمدردیاں کھو کر شاید صوبائی وزارت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“ جنرل سیکرٹری نے اپنی رائے پیش کی۔

بیٹے کی موت نے عوام میں پولیس کے خلاف خاصا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ ہسپتال سے مقتول طالب علم کی لاش وصول کرنے اس کے غزدہ لواحقین بھی گئے تھے لیکن وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔

لاش غیظ و غضب سے پھرے مرکزی لیگ کے ورکروں نے وصول کی اور ان کے صوبائی صدر کے جو شیلے خطاب کے فوراً بعد لاش کو وہ جلوس کی شکل میں اٹھا کر گورنر ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔

سیکورٹی کے ذمہ دار پل پل کی خبر اعلیٰ حکام کو پہنچا رہے تھے۔

پھرے ہوئے ہجوم کو گورنر ہاؤس کی طرف بڑھتے دیکھ کر پولیس نے راستے ہی میں ناکہ بندیاں کر لی تھیں۔ دو تین ناکہ بندیاں تو پارٹی کے جیالوں نے روند ڈالیں، لیکن گورنر ہاؤس سے کچھ فاصلے پر پولیس چوکس تھی۔ پولیس افسران نے پھرے ہوئے ہجوم سے لوٹ جانے کی درخواست کی اور انہیں یقین دلایا کہ ان کے مطالبات پر عمل ہوگا اور ذمہ داروں کے خلاف کارروائی ہوگی۔

لیکن.....!

ہجوم لاش کو گورنر ہاؤس تک لے جانے پر بضد رہا۔ وہ لوگ گورنر ہاؤس سے براہ راست بات کر کے اپنے جذبات پہنچانے اور یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد ہی وہاں سے واپس جانے کو تیار تھے۔ ان کی اس پچگانہ خواہش کی تکمیل پولیس کے اختیار میں نہیں تھی۔

بالآخر ایس پی صاحب نے ہجوم کو اس بات پر بھی رضامند کرنا چاہا کہ ان کے ذمہ دار دو چار لواحقین گورنر صاحب کو خود جا کر اپنے جذبات سے آگاہ کر دیں۔

لیکن.....!

یہاں کوئی ان کی سننے کو تیار ہی کب تھا۔ اس دوران ہجوم میں موجود کچھ لوگ اپنی غلط حرکات سے پولیس کو مسلسل اشتعال دلاتے رہے لیکن پولیس والے صبر و سکون سے کھڑے رہے..... اس سے پہلے کہ مقتول کے لواحقین جو خاصے شریف اور صلح پسند لوگ تھے، پولیس کی بات مان لیں۔ ہجوم نے نعرے بلند کئے اور پولیس پر ڈنڈوں سے حملہ کر دیا۔

پولیس کو بادل نخواستہ جوابی حملہ کرنا پڑا۔ جیسے ہی جوابی حملے کا آغاز ہوا، جیالے دم دبا کر

اس کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ نے مرکز سے صوبائی معاملات کو خراب نہ کرنے کی اپیل کی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ مرکزی لیگ کے شریکوں نے صوبائی معاملات پر سیاست کی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے ڈی آئی جی صاحب کو ہدایت کی تھی کہ بدتمیز اور مشتبہ عناصر پر نظر رکھی جائے اور مجرم کو جرم کرنے سے پہلے ہی کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے.....!

O

”واہ ملک صاحب! واقعی سیاست آپ کا میدان ہے.....!“ جیسے ہی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی ”سب اچھا“ رپورٹ مرکز میں موصول ہوئی، وزیر داخلہ نے ملک صاحب کی بے ساختہ تعریف کرتے ہوئے کہا۔

اس بات پر کوئی شک بھی نہیں تھا کہ اگر ملک صاحب کی جگہ کوئی معمولی افسر آدی ہوتا تو پانسہ ان کی طرف پلٹ جاتا۔ ملک نے کمال حراکاری سے اپنے مہرے ایک ایک کر کے آگے بڑھائے تھے لیکن وزیر اعلیٰ نے جس دانشمندی سے معاملات کو سنبھالا تھا اس پر مرکزی لیگ کو ضرور تشویش لاحق ہوگئی تھی اور وہ سمجھنے لگے تھے کہ مستقبل میں وزیر اعلیٰ ان کے لئے خطرات پیدا کر سکتا ہے۔

”سائیں! دیکھتے جاؤ۔ ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔“ ملک صاحب نے مونچھوں کو تالاؤ دیتے ہوئے کہا۔

وہ اسی روز شام کی فلائٹ سے واپس اپنے شہر آ گئے۔ جب ہوائی اڈے کے لاؤنج میں ایک رپورٹر نے ان سے صوبے میں ہونے والے حالیہ واقعات پر تبصرہ کرنے کو کہا تھا تو ملک صاحب نے فرمایا کہ وہ چونکہ دارالحکومت میں موجود تھے اس لئے مقامی حالات پر تبصرہ نہیں کر سکتے، البتہ ان کا ”محطات ترین تبصرہ“ یہی تھا کہ کسی کو قانون ہاتھوں میں لینے کی اجازت نہیں دینی چاہئے اور تعلیمی درسگاہوں میں سیاسی جماعتوں کی مداخلت بند ہونی چاہئے۔ انہوں نے مرکزی لیگ کی طرف سے آئندہ انتخابی حکمت عملی سے متعلق سوالات کے جوابات دینے سے انکار کر دیا۔ ملک جانتا تھا کہ صوبائی لیگ نے فی الحال اس کی طرف سے آنکھیں بند کی ہیں، لیکن یہ لوگ مستقبل میں اسے نظر انداز نہیں کریں گے اور اب اس کو بہت سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانا پڑے

اس کے بعد مختلف لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے وزیر اعلیٰ کی طرف دیکھا جنہوں نے حتمی فیصلہ کرنا تھا۔

تمام گرفتار طلباء کو رہا کر دیا جائے..... اخبار نویسوں اور عوام پر لاشمی چارج کا حکم دینے والے افسران کو فی الوقت لائن حاضر کیا جائے..... سٹوڈنٹ لیڈر شپ کے ساتھ فوری طور پر میٹنگ ارجح کی جائے۔“ وزیر اعلیٰ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”لیکن جناب! ٹرانسپورٹ.....؟“ جھنڈر کے منہ سے نکلا۔

وزیر اعلیٰ نے ایک مرتبہ پھر کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، پھر منہ موڑ کر اپنے سیکرٹری سے مخاطب ہوئے..... ”ٹرانسپورٹوں کے بھی ایک دو ڈھنگ کے نمائندے بلا لیجئے..... جھنڈر صاحب آخر اپنی برادری کو تو نظر انداز نہیں کریں گے.....!“ وزیر اعلیٰ نے آخری فقرہ کہہ کر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکالی۔

”آئیے حضرات! کھانا تیار ہے۔“ وزیر اعلیٰ کے اشارے پر کسی نے کہا اور وزیر اعلیٰ خود کھانے کی میز کی طرف بڑھے۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ اب فیصلے پر..... اپنے لوگوں کو رائے زنی کا موقع دیں نہ ہی وہ اس مرحلے پر کسی اپنے یا پرانے کی ناراضگی مول لے سکتے تھے۔

مستقبل پر نظر رکھنے والے جھنڈے مزاج کے نوجوان وزیر اعلیٰ نے لچ کی میز پر کسی کو موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اس مسئلے پر بات کرے۔ انہوں نے گفتگو کا رخ موڑ دیا تھا۔

دو گھنٹے کے اندر اندر ہنگامی میٹنگ طلب کر لی گئی تھی۔ اس میں تمام طلباء تنظیموں کے نمائندے شامل تھے۔ اعلیٰ صوبائی افسران کی اس میٹنگ کی سربراہی ایک مقامی وزیر صاحب کر رہے تھے۔ نوید اور گجر بھی دوسرے طلباء لیڈروں کی طرح یہاں موجود تھے..... فضا خاصی خوشگوار تھی۔

قریباً سب ہی لوگ چہروں پر منافقانہ مسکراہٹ سجائے ایک دوسرے کے الزامات سن رہے تھے۔ بالا خرابا ہی افہام و تفہیم کے ساتھ ان کے ساتھ معاہدہ طے پا گیا۔

ذمہ دار پولیس افسران لائن حاضر ہو گئے.....!

گرفتار طلباء رہا کر دیئے گئے۔

آتش فشاں

ارسلان کے لئے نجمہ ملک ایک مستقل ذہنی عذاب بنی ہوئی تھی۔ اس کا ضمیر رہ رہ کر اس کی مردانگی پر کچھ کے لگا رہا تھا کہ وہ ایک عورت کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہے۔ خود وہ بہت کچھ کر گزرنا چاہتا تھا لیکن ابھی وہ بے بس تھا۔ بھارتی سفیر کا تبادلہ اچانک ہی کسی دوسرے ملک میں کر دیا گیا تھا۔ کانٹا نے روانگی سے پہلے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ اس نے ارسلان سے کہا تھا کہ وہ جلد ہی اس سے رابطہ قائم کرے گی۔

انٹیلی جنس کے لئے اس میں اگر کوئی دلچسپی تھی تو اسی حوالے سے تھی۔ جب یہ حوالہ چھٹ گیا تو وہ لوگ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ رضوی صاحب اس سے کبھی کبھار مل لیا کرتے تھے۔ اپنی حب الوطنی اور وطن دوستی کے حوالے سے یہ شخص ارسلان کو پسند کرتا تھا۔ رضوی صاحب نے بھی اسے ایک دوست کے ناطے سے یہی مشورہ دیا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ طلباء سیاست سے کنارہ کشی کر لے۔

ایک دو مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کسی روز اعتماد میں لے کر وہ رضوی صاحب کو نجمہ ملک کے کروت اور خود پر بیٹنے والی قیامت سے آگاہ کر دے لیکن وہ کبھی خود میں اتنا حوصلہ نہ پاسکا۔ پھر

اور یہ تھی بھی حقیقت! صوبائی قیادت نے اس کے خطرے کو نظر انداز نہیں کیا تھا اس کے لئے پیش بندی شروع کر دی تھی۔



”ٹھیک ہے.....!“ اس نے کہا۔
 ”کل تم پریس کانفرنس میں طلباء سیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دو۔“ نجمہ ملک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

○

اگلے روز ایک ہوٹل میں ارسلان کی طرف سے کچھ اخباری نمائندوں کے سامنے طلباء سیاست سے علیحدگی کا اعلان ہو گیا۔ اس نے کہا کہ کالجوں میں سیاسی جماعتوں اور غیر طلباء عناصر کی مسلسل مداخلت کے خلاف ایک عرصہ تک جنگ جاری رکھنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس..... گندی سیاست کو خیر باد کہہ دے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی توجہ سیاست سے ہٹا کر صرف تعلیم پر مرکوز کر دیں اور اپنے والدین کا سہارا نہیں جو نجانے کیا کیا ستم جھیل کر اپنے مستقبل کا سہارا بناتے ہیں۔ ارسلان نے اپنے مستقبل کے عزائم سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ اب اس کی زندگی کا مقصد معاشرے کے پسماندہ طبقات کی خدمت ہے اور اس نے اپنی باقی زندگی اصلاح معاشرے اور خدمت خلق کے لئے وقف کر دی ہے..... اس ضمن میں اس نے نجمہ ملک صاحبہ کی ”فلاحی فاؤنڈیشن“ سے منسلک ہونے کا اعلان کیا تھا۔

ارسلان نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ فلاحی فاؤنڈیشن غنقریب غریب اور نادار مریضوں کے لئے ایک فری جنرل ہسپتال قائم کر رہی ہے جس کے لئے زمین حاصل کر لی گئی ہے۔ اس فاؤنڈیشن کے تحت پہلے ہی سے غریب اور بیوہ عورتوں کے لئے ایک سلائی کڑھائی سیکھنے کا مرکز قائم ہے۔ اس کے علاوہ یتیم بچوں کے لئے وہ لوگ ایک گوشہ عافیت بھی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پریس کانفرنس کے خاتمے پر وہ جب گھر کی طرف آ رہا تھا تو ایک ٹریفک سگنل پر اسے روک لیا گیا۔

وہ اندازہ نہ کر سکا کہ پریس کانفرنس کے فوراً بعد ہی جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو ایک جیپ اس کا تعاقب کرتی اس کے ساتھ ہی یہاں تک آئی تھی۔ شاید اس جیپ کے وائبر لیس سیٹ سے ہی اگلے چوک میں پولیس کو ہدایت ملی تھی کہ وہ اس کا روک لے۔
 ”لاسٹنس دکھائیے جناب!“ ایک سارجنٹ نے اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

اس نے ان لوگوں کے قریب سے دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ اپنی سطح پر یہ سب لوگ بے بس ہیں اور صرف احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ انہیں اپنی رائے دینے کا حق حاصل نہیں..... یوں بھی ایک انپکٹر بے چارہ اس کے لئے کیا کر سکتا تھا؟

اس کے لئے فی الوقت خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑے رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ”میرے خیال میں تم سٹوڈنٹس پالیٹکس سے علیحدگی کا اعلان کر دو کیونکہ معاملات بہت بگڑ چکے ہیں۔ یوں بھی اب تمہیں اپنی لائن تبدیل کر لینی چاہئے.....!“ نجمہ ملک نے گھر پہنچتے ہی اسے رائے دی۔

”لیکن ملک صاحب کو اس طرح اچانک چھوڑ دینا.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔
 ”نہیں ایسی بات نہیں۔ تم مجھے یا ملک صاحب کو نہیں صرف طلباء سیاست کو خیر باد کہہ رہے ہو۔ میں نے اور ملک صاحب نے مل کر تمہارے مستقبل کی بہتری کے لئے ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔“ نجمہ ملک نے اس کی بات کاٹ کر سرگرمی سے سناٹے ہوئے کہا۔
 ”آج کل آپ میری بہتری کی کچھ زیادہ ہی فکر کرنے لگی ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکل گیا۔

”تم ہمارے اپنے جوہو.....!“ نجمہ ملک نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
 وہ ارسلان کو بچوں کی طرح بہلا رہی تھی.....!
 شاید اسے ارسلان کی صورت میں کوئی کھلونا ہاتھ لگ گیا تھا۔ کتنی اذیت پسند تھی وہ.....!

”یہاں کی آب و ہوا بھی کچھ سا زگار نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ایک آدھ چکر لندن کا اور لگالو..... کچھ تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔“
 اس کی تجویز معقول تھی۔

گوکہ اس ”چکر“ کا مطلب ارسلان اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن وہ کم از کم کچھ عرصے کے لئے اس سے دور تو رہ سکتا تھا۔ یوں بھی اب اس نے لاشعوری طور پر شاید اس ملک کو چھوڑ دینے کا فیصلہ ہی کر لیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید دنیا کے کسی دوسرے ملک میں اپنے حالات سے کٹ کر وہ ایک الگ اور مطمئن زندگی کا آغاز کر سکے گا.....!

جب اس کی زبان کسی طرح بند ہی نہ ہوئی تو ان میں سے ایک نے اس کی کپٹی پر ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ ارسلان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”سالا چپ ہی نہیں کرتا.....!“ دوسرے نے زوردار گھونسا اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔

غصے اور تکلیف سے پیچ و تاب کھاتے ارسلان نے جب مزاحمت کرنا چاہی تو تینوں اس پر پل پڑے اور چند منٹ ہی میں اسے آٹے وال کا بھاؤ بتا دیا۔

○

جہاں وہ لوگ اسے لائے تھے وہ شاید ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ سفر اس نے شدید تکلیف میں کاٹا تھا۔ وہ قریباً نیم بے ہوش تھا۔ جیپ ایک قلعہ نما کوٹھی کے لان میں داخل ہو رہی تھی جس کے دروازے پر ایک مسلح سپاہی موجود تھا۔ اس نے گیٹ کھولا تھا۔

گیٹ سے اندر داخل ہو کر انہوں نے گیٹ کے ساتھ بنی ایک چیک پوسٹ کے رجسٹر میں کچھ اندراج کیا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دور جا کر جیپ پھر ایک جگہ رک گئی۔ انہوں نے قصائی کے بکرے کی طرح اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے کھینچا اور زمین پر گرتے ہی اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔

خدا جانے یہ کون سی جگہ تھی۔ یہاں انسان بستے تھے یا درندے..... ارسلان نے دیکھا کہ اسے مار پڑتے دیکھ کر سامنے کی بیرک سے دو اور سفید پوش ڈنڈے تھامے بھاگتے ہوئے وہاں آ گئے۔ وہ ارسلان پر اس طرح لائٹیاں برسار رہے تھے جیسے وہ گوشت پوست کا انسان نہیں، کوئی آہنی قلعہ ہے جسے وہ سر کرنے جا رہے ہوں۔

اسے اپنے بدن کی ساری ہڈیاں جتنی محسوس ہو رہی تھی۔

خونزدہ بچوں کی طرح وہ گڑ گڑا رہا تھا۔ ان سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ اس کا سارا مظنہ دم توڑ چکا تھا لیکن یہ لوگ اس کی منت سماجت پر دھیان دیئے بغیر اسے جانوروں کی طرح پیٹ رہے تھے۔ مارتے مارتے وہ اسے گھسیٹتے ہوئے بیرک کے سامنے بنے سیلوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے آخری منظر یہی دیکھا۔ ان سیلوں سے خونزدہ چوروں والے کچھ لوگ جن کی شکلیں بظاہر تو انسانوں جیسی تھیں، لیکن اپنی حالت سے وہ جانور دکھائی

”لیکن کیوں.....؟“ ارسلان کو غصہ آ گیا۔

”میں بتاتا ہوں..... آپ ذرا گاڑی سے باہر تشریف تو لائیں۔“ اس کے تعاقب میں آنے والی جیپ سے ایک شخص نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

جیپ انہوں نے اس طرح اچانک اس کی گاڑی کے ساتھ لگا کر کھڑی کی تھی کہ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کون ہو تم لوگ.....؟“

خطرے کا احساس ہوتے ہی اس نے کار کے ڈیش بورڈ میں اپنے پستول کو پکڑنا چاہا۔ جیسے ہی اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی جیپ سے اترنے والے نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر اسے جھٹکا مارا اور کار کا دروازہ دوسرے ہاتھ سے کھول کر اسے باہر نکال لیا۔

ارسلان کی مدافعت سے پہلے ہی باقی جیپ سوار اس کے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے پستول نکال کر اس کی کپٹی سے لگا دیا۔

”خبردار! زیادہ ہوشیاری نہ دکھانا۔“ اس نے لٹکارتے ہوئے کہا۔

پولیس والے اس دوران بڑے اطمینان سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ارسلان کو غصے کے ساتھ حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ یہ لوگ اس کی مدد کیوں نہیں کرتے۔

اس نے دو تین مرتبہ پولیس والوں کو گالی دے کر اپنا تعارف بھی کر دیا تھا، لیکن کسی نے اس کی طرف منہ موڑ کر دیکھا بھی نہیں تھا۔

”الو کے پٹھے۔ ہم بھی پولیس والے ہیں اور تمہیں گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔“ سفید پوشوں نے اسے دھکے دے کر جیپ کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ انہوں نے اسے قریباً اٹھا کر ہی جیپ میں پھینکا تھا۔ تین آدمی اس کو سنبھال کر بیٹھ گئے۔ چوتھے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور جیپ چل پڑی۔

ارسلان پاگلوں کی طرح کبھی انہیں گھورتا، کبھی ان سے پوچھنے لگتا کہ آخر وہ اسے کیوں پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ اس نے اب تک نجانے کتنی مرتبہ انہیں دھمکیاں دی تھیں کہ وہ ان کی بیٹیاں اتروادے گا۔

لیکن وہ لوگ تو اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہے تھے۔

ڈال دیا۔

”کیوں بھی! ہوش آ گیا؟“ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

ارسلان کا حلق تو تر ہو گیا لیکن گیلے کپڑے اب تک اس کے زخموں سے چمٹ رہے تھے۔ ابھی بمشکل تین چار منٹ ہی گزرے تھے جب وہاں تین بٹے کئے ملازم آئے دھمکے۔ ان کے تعاقب میں وہی شخص آ رہا تھا جس نے جیب میں اس کی ٹھکانی کی تھی۔

ارسلان بہم گیا.....!!!

”باہر نکالو اے اس لیڈر کی اولاد کو۔ اس کی کمبل پر بٹ کر اوڈرا۔“ اس نے تینوں کو حکم

دیا۔

ان میں سے ایک نے اس کے سیل کو کھولا اور باقی دونوں نے اسے جانوروں کی طرح باہر نکال لیا۔

ارسلان چیخا چلاتا ہی رہ گیا..... وہ اسے گھینٹے ہوئے ایک کمرے کی طرف لے گئے۔ تیسرا جس نے اس کے سیل کا تالا کھولا تھا اب اپنے ہاتھوں میں ایک کمبل پکڑے وہاں کھڑا تھا۔ ان لوگوں نے کونے میں رکھے بڑے بڑے ڈنڈے تھام لئے۔

اچانک ہی تیسرے نے دھکادے کر اسے زمین پر گرادیا۔ چیخے چلاتے ارسلان کو یوں لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ اس نے چاہا کہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر کمبل سے نجات حاصل کر لے کہ اچانک اس کے بدن پر عذاب نازل ہونے لگا۔ تینوں نے اس کو ڈنڈوں سے پیشنا شروع کر دیا۔

ارسلان کی چیخیں بھی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔

اسے یوں لگا جیسے وہ مر رہا ہے.....!

آہستہ آہستہ اس کے بدن سے جان نکل رہی ہو.....!

لیکن وہ زندہ رہا.....

○

انہوں نے اسے مرنے نہ دیا..... بے ہوش ہونے پر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے

پھینک کر وہ اسے ہوش میں لے آتے۔

دے رہے تھے اسے جھانک رہے تھے۔

اس کے ہمراہیوں نے انہیں بھی گالیاں دے کر اپنے منہ دوسری طرف کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے بٹن کے ساتھ چلنے والی مشینوں کی طرح اپنے منہ دیواروں کی طرف پھیر لئے۔

ارسلان اب چیختے چیختے بے ہوش ہو چکا تھا.....!

انہوں نے ارسلان کے نیم مردہ جسم کو گھسیٹا اور اسے ایک سیل میں ردی کے ڈھیر کی طرح پھینک کر اسے باہر سے تالا لگا دیا۔

○

تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا جیسے اس کے بدن کی ساری ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ اسے اپنا بدن گوشت کا بے جان لوتھر محسوس ہو رہا تھا۔ منہ میں خون کا ذائقہ ابھی تک محفوظ تھا اور جہاں تک وہ اپنی گردن گھما کر دیکھ سکتا تھا اسے اپنے بدن پر نیل ہی نیل دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے حلق میں جیسے کسی نے کانٹے دار جھاڑیاں اگادی تھیں۔ اس کے لئے تھوکن گھٹنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

اس بات کا اندازہ تو اسے ہو گیا کہ یہ بھی سیکورٹی کے لوگ ہیں لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخروہ اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟

وہ تو ان کے لئے کام کرتا آیا ہے اور یہ لوگ اسے مارنے کے لئے یہاں لائے ہیں؟ ”اوئے اٹھ اوئے۔ ہاتھ باہر نکال۔“ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایک شخص پانی کا ڈول لئے سیل کے باہر کھڑا تھا۔ ارسلان سہمے ہوئے چوڑے کی طرح سیل کی سلاخوں کے نزدیک آ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیر باہر نکال دیئے تھے۔ آواز دینے والے نے اسے منہ کھولنے کی ہدایت کی..... اور..... ارسلان نے اس کے حکم پر جانوروں کی طرح منہ کھول دیا۔ اس شخص نے وحشیانہ تہقہہ لگایا اور پانی کا ڈول اس کے منہ پر پھینک دیا۔ کچھ پانی اس کے حلق میں چلا گیا اور زیادہ اس کے کپڑوں پر۔

گھبرا کر اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے۔

لیکن..... جواب میں دو چار گالیاں کھا کر وہ دوبارہ اسی ایکشن میں واپس آ گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس پر پانی پھینکا گیا۔ تیسری مرتبہ اس شخص نے باہر سے پانی اٹھایا اور اس کے حلق میں

رہا۔ شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

”اچھا گویا تم اس طرح نہیں مانو گے.....؟“ یہ کہہ کر اس نے کمرے کے ایک کونے میں گھنٹی کا بٹن دبایا۔

دو ملازم ایک ساتھ اندر آئے.....!

”اسے لاؤ اوئے ذرا..... موہن لال کو.....!“

اس نے دونوں کو حکم دیا۔

”ابھی پتہ چل جاتا ہے بیٹا.....!“ انچارج نے ارسلان پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک ادھ موآ دی آ گیا۔ جس کو وہ موہن لال کہہ کے مخاطب کرتے

تھے۔

”اسے جانتے ہو.....؟“ اس نے ہاتھ باندھے موہن لال کو مخاطب کیا۔

”ہاں جناب! اس کا نام ارسلان ہے۔ میں ان سے ہی ملنے جا رہا تھا۔“ موہن لال

نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

ارسلان ہکا بکا ہی رہ گیا.....!

اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دن میں تارے ناچتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے زندگی میں کبھی اس شخص کی جھلک نہیں دیکھی تھی جس نے ارسلان کی حیثیت سے نہ صرف شناخت کیا بلکہ اس کے سارے ٹھکانے فون نمبر ماضی کے خاصہ واقعات بھی بیان کر دیئے۔

ارسلان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟ یہ شخص کون تھا؟ اسے کس نے اس کے متعلق اتنا کچھ بتا کر یہاں بھیجا تھا؟

”لے جاؤ اسے!“ انچارج نے حکم دیا اور وہ لوگ موہن لال کو واپس لے گئے۔

”دیکھو بچو! یہاں تو گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔ تمہاری تو پھر بھی زبان ہے۔“

اچانک ہی ارسلان کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

”کہیں کانتا نے تو اس شخص کو نہیں بھیجا؟“ اس نے رضوی صاحب کے کہنے پر کانتا کو

ایسا تاثر تو دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ ملنے کے لئے تیار ہے۔“

جب تینوں تھک گئے تو اسے ہوش میں لا کر خود اپنے انچارج کے اشارے پر باہر چلے گئے۔

اب دونوں اندر اکیلے ہی بیٹھے تھے۔ یہ وہی شخص تھا جو اسے اغوا کر کے لایا تھا۔

”کیوں بے دماغ ٹھکانے آ گیا ہے یا نہیں..... اگر لیڈری کا بھوت دماغ سے نہیں

نکلا تو ایک آدھ کورس اور کراؤں؟“

”نہیں جناب..... خدا کے لئے نہیں.....“ وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔

”اب کان کھول کر سن لو۔ جو سوال کروں اس کا صحیح جواب دینا۔ اگر ذرا سی بھی ہوشیاری دکھائی تو دونوں بازو اور ٹانگیں توڑ کر جیل میں پھینکوا دوں گا اور ساری زندگی اپا بھوں کی طرح ریگتے ریگتے مر جاؤ گے۔“

ارسلان کو احساس ہو رہا تھا جیسے یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کرنے پر قادر بھی ہے۔ ”مم..... میں بتاؤں گا.....!“ وہ کھکھکیا۔

”تم اٹھیا کے لئے کب سے جاسوسی کر رہے ہو؟“ پہلے سوال نے اس کی جان نکال دی تھی۔

”کک..... کیا مطلب؟ کیا مطلب؟“ جیسے اس کے کانوں میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔

اس کا مطلب ہے کہ ابھی تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں آیا۔ ابھی تھوڑی کسر باقی ہے۔“ انچارج افسر نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے جناب! میں اس وقت آپ کے اختیار میں ہوں۔ جو چاہے آپ میرے ساتھ کر سکتے ہیں، لیکن ایسا گھناؤنا الزام مجھ پر نہ لگائیے..... مجھے گولی مار دیں لیکن آپ مجھ سے ایسے جرم کا اقبال نہیں کروا سکتے جو مجھ سے سرزد ہی نہیں ہوا۔“

انچارج حیران تھا۔

کہ جیسے اچانک ہی اس کا واسطہ بدلے ہوئے ارسلان سے پڑا ہو۔ اس الزام نے جیسے اچانک ہی ارسلان کو دلیر بنا دیا ہو۔ ورنہ کچھ دیر پہلے تک تو وہ سہمے ہوئے چوزے کی طرح اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ ایک دو لمحے کے لئے وہ بے یقینی کے سے عالم میں اس کی طرف دیکھتا

ارسلان نے جان لیا کہ انکو اتری پر اس کا بیان سچ ثابت ہوا تھا اور وہ لوگ اسے یہاں پھینک کر چلے گئے۔ شاید اس کا اندازہ صحیح تھا اور کانتا کے حوالے سے بھارتی انٹیلی جنس نے کسی جاسوس کو اس کے پاس بھیج دیا تھا۔

اور شاید اس کے ملک کی کاؤنٹر انٹیلی جنس نے تفتیش کے لئے یہی طریقہ مناسب سمجھا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہاں لوگوں کے متعلق کیا رائے قائم کرے۔

بڑبڑاتے ہوئے اس نے بے شمار گالیاں دیں اور ایک رکشہ کے ذریعے گھر پہنچا۔ رکشے والے کو بھی اس نے دھمکی دے کر جانے پر رضامند کیا تھا۔ ورنہ اس کی حالت دیکھ کر تو کوئی اسے بٹھانے کے لئے بھی رضامند نہ ہوتا۔ گھر پر نجمہ بیگم بے چینی سے اس کی منتظر تھی.....! اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

☆ ☆ ☆

”آفسیر تم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو..... پہلے میری پوری بات سن لو۔ اس کے بعد جو دل چاہے کر لیتا۔“

”بکوا“ انچارج نے اسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

ارسلان نے اسے کانتا کے ساتھ ملاقات کی ساری کہانی سنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ رضوی صاحب کا آدمی ہے۔ انچارج اس کی تمام باتوں کے نوٹس لے رہا تھا۔ اس نے رضوی صاحب کا نمبر نوٹ کیا اور اسے کچھ سوچتے ہوئے واپس سیل میں بھیج دیا۔

اس مرتبہ وہ لوگ اسے آرام سے لائے تھے۔ سیل میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد اسے کاغذ قلم مہیا کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ تمام واقعات بلا کم و کاست لکھ دے۔

کچپکپاتے ہاتھوں سے اس نے کہانی لکھنی شروع کر دی۔

رات تک اس نے ساری کہانی لکھ دی۔

رات کا کھانا اسے ایک سیل میں دیا گیا.....!

آدھی رات کو پھر وہ لوگ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس مرتبہ اس کے سامنے تین آدمی بیٹھے تھے۔ دوبارہ اسے سارے واقعات سنانے کے لئے کہا گیا تھا۔ تینوں اس سے باری باری سوالات کرتے رہے..... قریباً دو اڑھائی گھنٹے بعد انہوں نے اسے کافی پلائی۔ اب ان کا رویہ خاصا ”مہربانہ“ ہو گیا تھا۔ کافی پینے کے بعد ارسلان کو ہوش نہ رہا.....!

○

جب ہوش آیا تو وہ شہر کے ایک پارک میں ایک بچ پر لیٹا تھا۔ کسی نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا۔ شاید یہ اس باغ کا کوئی مالی تھا۔

دھوپ میں اس کا بدن جلنے لگا تھا..... سارا جسم پسینے سے شرابور اور دکھتا ہوا پھوڑا بن رہا تھا۔

تھا۔

”باؤ جی! کوئی لمبا ہی کش لگایا ہے..... دوپہر ہو گئی ہے اور آپ دھوپ میں سو رہے ہیں۔ شاید نشہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا.....!“ مالی نے طنز سے کہا۔

”شکر کرو باؤ جی۔ کسی پولیس والے نے نہیں دیکھا ورنہ.....“ اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

ہو۔

میرے کو طلب کر کے اس نے چائے وہیں لانے کو کہا تھا۔ ارسلان نے اس سے درد کی گولیاں بھی منگوائی تھیں۔ ابھی تک اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ایک دو منٹ وہ چھت کو اور مسز ملک کو گھورتا رہا۔ پھر ہاتھ روم کی طرف چل دیا۔

اس نے چپ چاپ چائے کے ساتھ دو گولیاں نگلیں۔ پھر نجمہ ملک کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مجھے علم نہیں وہ لوگ کون تھے۔ انہوں نے مجھے کارروک کر اغوا کر لیا اور اپنے آفس میں لے گئے۔ اس کے بعد میری یہ حالت بنائی اور رات ہی کسی وقت باغ میں پھینک کر چلے گئے۔“ اس نے مختصر بات کرنا چاہی۔

”مخالف تنظیم کے لوگ تھے کیا؟“ نجمہ ملک کو الجھن سی ہونے لگی۔

”نہیں، سرکاری لوگ تھے۔“

”کیسے کہہ سکتے ہو تم؟“

”میں بھائی ہوش و حواس ہوں مسز ملک۔“ اسے نجانے کیوں غصہ آ رہا تھا، لیکن وہ

سنجھ گیا۔

نجمہ ملک صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”آخر کوئی الزام تو ہوگا تم پر؟ کچھ تو وہ کہتے ہوں گے؟“ نجمہ ملک نے اس کے نزدیک

بیٹھ کر بڑی اپنائیت سے دریافت کیا۔

”ہاں۔“ ارسلان نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر کہا۔ ”شاید آپ سننا پسند نہ

کریں۔“ اس نے اندھیرے میں تیر چلا دیا۔

”تم کہو ارسلان! میں ہر وقت ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتی

ہوں۔“ اس نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا۔

”ان کا کہنا تھا کہ میں نے لندن کا چکر آپ کے کام سے لگایا ہے۔“ ارسلان کو اچانک

ہی نجانے کیا سوچھی۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔

”کس کام سے؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

ارسلان نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا اندھیرے میں چھوڑا تیر نشانے پر لگا ہے۔ مسز

دوسرا روپ

”کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“ اس نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ

پوچھ لیا۔

”ٹھیک ہے کچھ غلط نہیں ہو گئی تھی۔“ ارسلان نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

”کیسی غلط نہیں..... تمہاری یہ حالت کیسے؟ کل سے تم کہاں غائب ہو؟“ مسز ملک کی

بیقراری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

”چائے کے لئے کہہ دیجئے۔ بتاتا ہوں۔“ اس نے پہلو بدل کر کہا تو منہ سے کراہ نکل

گئی۔

مسز ملک اب اس کے نزدیک پہنچ کر گہری اور تشویشناک نظروں سے اس کا جائزہ لے

رہی تھی۔

”زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے ارسلان کے کندھوں پر دباؤ

ڈال کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

ارسلان اس کی طرف دیکھ کر صرف مسکرا کر رہ گیا۔

وہ جانتا تھا مسز نجمہ ملک کو یہی فکر دامن گیر ہو گئی ہوگی کہ کہیں ان کا گھوڑا زخمی ہی نہ ہو گیا

اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کہا تھا۔
 ”اب انہیں یقین ہو گیا ہوگا کہ میں بہر حال قربانی کا بکرا نہیں۔“ اس نے چلتے چلتے
 اچانک ہی مڑ کر نجمہ ملک کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔
 نجمہ ملک نے اس کے لہجے کی کاٹ محسوس کر لی تھی، لیکن خلاف معمول وہ مسکرائی نہیں۔
 ارسلان خوش ہو رہا تھا کہ اس نے کم از کم نجمہ ملک کو کچھ عرصہ کے لئے تو ذہنی اذیت
 سے دوچار کیا۔

وہ نہیں جانتا تھا اچانک ہی اس کے ذہن میں عود کر آنے والے اس خیال نے نجمہ ملک
 کے دل میں ہمیشہ کے لئے تشنیک کا زہر بھر دیا ہے۔ یہ خبر کہ حکومت کی اٹیلی جنس ایجنسیاں اس پر
 کسی دوسرے سلسلے میں بھی شبک کر سکتی ہیں یا اس کا ”غیر ملکی بزنس“ حکومت کے علم میں ہے اس کو
 پریشان کر دینے کے لئے کافی تھا۔

○

نجمہ ملک کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ سجاد خان سے اس کے روابط کی
 خبر سرکار دربار تک بھی پہنچ گئی ہے۔
 جب ارسلان اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹا خاصا سکون محسوس کر رہا
 تھا۔

عین ان ہی لمحات میں مسز ملک اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر باغ میں سرو کے
 پودوں پر نظریں جمائے سگریٹ کے مرغولے فضا میں بکھیر رہی تھی۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کی
 عورت تھی۔

اگر عام قسم کی عورت ہوتی تو حادثہ کے جن طوفانی تہیڑوں سے اس کا ماضی میں
 واسطہ رہا تھا ان کی زد میں کبھی کی ٹوٹ کر بکھر چکی ہوتی۔
 لیکن.....!

آج وہ پریشان تھی.....!

ارسلان کی اس اطلاع نے کہ اس سے سیکورٹی والے نجمہ ملک کی ”دوسری حیثیت“
 کے متعلق پوچھ گچھ کرتے رہے تھے اسے پریشان کر دیا تھا۔

ملک کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لئے بدلا تھا، لیکن فوراً ہی اس نے اپنی حالت پر قابو پایا۔
 ”کس کام سے! یہی تو وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ یہی تو وہ مجھ سے اگلوں کا چاہتے
 تھے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا۔ میں نے سرے سے اس بات کو تسلیم ہی نہیں کیا کہ مجھے آپ نے بھیجا ہے۔
 میں نے یہی اصرار کیا کہ میں اپنی مرضی سے گیا ہوں۔ میں نے ان کے سامنے ایک ہی رٹ
 لگائے رکھی کہ وہ مجھے اعلیٰ حکام کے حکم پر تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں اور مجھے سیاسی اختلافات کی
 بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔“
 ”پھر کیا ہوا؟“ مسز ملک کی بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی اور ارسلان خاصی تسکین
 محسوس کر رہا تھا۔

”پھر کیا! وہ مجھے گھما پھرا کر اس طرف لاتے تھے کہ میں نے ضرور کوئی غلط کام کیا ہے
 اور آپ سے نزدیک ہونے کا کچھ اور ہی مطلب لے رہے تھے۔“

”گدھے.....! الو کے پٹھے.....!“ نجمہ ملک نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔
 ”گھبرائیے نہیں مسز ملک۔ میں زبان کا مرد ضرور ہوں۔ میں نے آپ پر آج نہیں
 آنے دی۔ اگر وہ مجھ سے کچھ اگلوں نے میں کامیاب ہو جاتے تو مجھے یوں پھینک کر نہ چلے جاتے۔
 میں نے سارا عذاب اپنی جان پر جھیلا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں نجمہ ملک کی حالت سے
 محفوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”کوئی اور چکر تو نہیں تھا؟“ اچانک ہی نجمہ نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”ابھی تو نہیں، مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں
 ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں گاڑی کہاں ہے؟ یہ واقعہ کیٹی چوک میں پیش آیا۔ شاید گاڑی
 وہیں موجود ہو یا پھر پولیس کے پاس ہوگی۔“

”تم گاڑی کی فکر نہ کرو۔ جہنم میں گئی گاڑی۔ یہ سارا سیاسی چکر ہے۔ وہ لوگ ملک پر
 ہاتھ ڈالنے کے لئے کوئی نہ کوئی قربانی کا بکرا ضرور تیار کریں گے۔ آخر حکومت یہ سب کچھ ٹھنڈے
 پیٹوں تو برداشت کرنے سے رہی۔“ ارسلان جانتا تھا کہ آخری فقرہ اس نے ارسلان سے زیادہ

ارسلان تو اس کا تیسرا شکار تھا۔

یہ اس کا کمال فن تھا کہ جہاں ایک طرف اس نے ملک ایسے گھاگ سیاستدان کو گھیرا تھا، وہاں اس نے سجاد خان ایسے بین الاقوامی شہرت یافتہ منظر کو بھی اپنی زلفوں کا اسیر بنا رکھا تھا.....! اس کے تعلقات کی نوعیت کچھ بھی ہو، حیرانگی کی بات یہ تھی کہ سجاد خان اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

وہ گھٹا گھٹا کا پانی پینے والا پانی جانے اس گھاٹ پر پلٹ پلٹ کر کیوں آتا تھا۔ یہ سانولے بدن والی نجمہ.....!

پنجاب کے ایک پسماندہ دیہات کی رہنے والی بی اے پاس استانی۔ جس نے ایک ”سیاسی دعوت“ میں سجاد خان کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی محبوبہ اور اب ”بزنس پارٹنر“ بننے لگی تھی۔

ایک داؤد اگر سجاد خان اسے بتاتا تو دس داؤد سجاد خان کو سکھا دیتے تھے۔

اس کے اعتماد اور بے خونی کو دیکھ کر کبھی کبھی تو سجاد خان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ یہ عورت اس میدان کی کوئی پرانی کھلاڑی ہے..... اس نے نو واردوں کی طرح کبھی ڈمگاتا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

لیکن.....!

آج زندگی میں شاید پہلی مرتبہ وہ گھبرائی تھی۔

اس کا اعتماد پہلی مرتبہ ڈمگایا تھا۔

اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ آج تک اس نے جرائم کی دنیا کا سفر بڑے اعتماد سے کسی خطرے کا سامنا کئے بغیر طے کیا تھا۔

پیسہ، سفارش، ناز و ادراغ داب وہ ہر ہتھیار کا بہترین استعمال جانتی تھی۔ اپنے راستے میں آنے والی ہر دیوار کو اس نے پائے حقارت سے ٹھوکر مار کر گرایا تھا۔

لیکن.....!

آج جب اسے علم ہوا کہ ارسلان کو انٹیلی جنس والے اغوا کر کے لے گئے تھے اور انہوں نے اس پر تشدد کر کے نجمہ بیگم سے متعلق کوئی بات اگلوانے کی کوشش کی ہے تو زندگی میں پہلی بار اس

وہ بہت ہوشیار عورت تھی۔ اس نے کوئی ایسا کھواپے پیچھے نہیں چھوڑا تھا کہ کوئی اس پر شک کر سکے۔ سجاد خان سے اس کے تعلقات کی نوعیت کا صحیح علم تو ملک صاحب کو بھی نہیں تھا۔ ملک کو صرف اتنا علم تھا کہ وہ خاصی اونچی اڑ رہی ہے۔

یورپ اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ملک نے اس کا سبب جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خوش تھا کہ نجمہ بیگم خوش ہے۔ اس کا علم تو اسے بعد میں ہوا کہ دراصل اس نے نجمہ کو نہیں پھنسا یا تھا، خود وہ اس کے جال میں پھنسا تھا..... اور ایسا پھنسا تھا کہ پھر پھنستا ہی چلا گیا.....!

نجمہ بیگم نے جب پہلا پھیر لگایا تو ملک کو بڑے فخر سے اپنے اس ”کارنامے“ سے آگاہ کیا تھا اور ملک نے بھی اسے ”بیگم صاحبہ کی ادا“ سمجھ کر قبول کر لیا۔ وہ جانتا تھا سوسائٹی کی جن بیگمات میں نجمہ کا اٹھنا بیٹھنا ہے ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جو کبھی کبھی بطور شغل یا پھر محض چینیج کے لئے اس طرح کا ایک آدھ پھیر لگایا کرتی ہیں۔

درجنوں معزز گھرانوں کی بیگمات کو وہ جانتا تھا جو یورپ کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسی نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جو عمال حکومت کی نزدیکی رشتہ دار تھیں۔

ملک کی اطلاع کی حد تک نجمہ بیگم نے ایک دو پھیرے خود ہی لگائے تھے جس کے بعد سے ارسلان اس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ عین ممکن ہے اس نے ارسلان سے پہلے بھی کسی کو ان ”خدمات“ پر مامور کیا ہو۔

لیکن ملک صاحب کو اس کا علم نہیں تھا کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا جو گروہ اس کے گرد اکٹھا رہتا ہے ان میں سے کتنے لوگ نجمہ بیگم کے قریب اور کتنے ”زیادہ قریب“ ہیں۔

بہت ہوشیار اور سیاسی جوڑ توڑ کے ماہر ملک صاحب کو تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ اس کی لاڈلی بیگم نے اس شہر کے دو معزز گھرانوں کی لڑکیوں کو یورپ کی جیلوں میں پہنچا دیا ہے۔

ایک پہلے ہی پکڑ میں اور دوسری بدقسمت لڑکی تیسرے پکڑ میں پکڑی گئی تھی۔

دونوں نے عدالت میں چونکہ رضا کارانہ طور پر اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا شاید اسی لئے انہیں دس دس سال قید کی سزا کا حکم ملا تھا.....!

دریافت کئے پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ نجمہ ہونٹوں سے کافی کی پیالی لگائے اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اچانک ہی وہ چلتے چلتے رک گیا..... یہ اس کا خاص انداز تھا۔ جب اس نے کوئی اہم بات کہنی ہوتی تو اسی طرح چونکا دینے والے انداز میں کہا کرتا تھا۔

”تم نے اس کی بات سے یہ کیسے اندازہ کر لیا کہ تفتیش کرنے والوں کا اشارہ اسی طرف تھا؟ اگر ایسی بات تھی تو وہ براہ راست بھی یہ سوال کر سکتے تھے؟ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ مخالف تنظیم کے ہی لوگ ہوں جنہوں نے بظاہر سیکورٹی والوں کا لبادہ اوڑھ کر اسے اغوا کیا ہو؟“

سجاد خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

ایک لمبے کے لئے تو نجمہ بیگم چکر کر رہی رہ گئی۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ ارسلان نے اسی کا داؤ اسی پر کھیلایا ہو۔ اس انکشاف کے بعد کہ وہ اسے بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں آگئی ہے ارسلان کی حالت یقیناً پنجرے میں بند اس شیر کی سی ہو گئی تھی جسے تازہ تازہ افریقہ کے کسی جنگل سے پابند سلاسل کر کے یہاں لایا گیا ہو۔

نجمہ بیگم کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ وقت سے پہلے ”ہنروالی“ بن گئی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ملک صاحب کے زیر سایہ ارسلان ایسے درجنوں نوجوانوں کی انانیت کب کی دم توڑ چکی تھی اور وہ اپنے منصب سے گر کر ملک صاحب کے بندۂ بے دامن بن کر رہ گئے تھے لیکن شاید ابھی ارسلان میں غیرت کی رت باقی تھی۔ اس نے نجمہ بیگم کی غلامی کو مصلحتاً قبول کر لیا تھا، لیکن وہ بھی اب اپنے داؤ پر تھا.....!

سجاد خان نے اسے کہا تھا کہ وہ ایک دو دن کے اندر اندر کس ایجنسی نے اغوا کیا اور کیوں؟ کا جواب ڈھونڈ لے گا۔

اور..... نجمہ بیگم سمجھتی تھی کہ جو کچھ سجاد خان نے کہا ہے وہ کچھ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور رسائی بہت دور تک تھی۔

لیکن..... اس بات کا اندازہ تب مسز ملک کو بھی نہ ہو سکا کہ اس مرتبہ معاملات اس کی رسائی سے بھی باہر ہیں۔

گھر آ کر اس نے اپنے چہرے سے کوئی غیر معمولی بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ گاڑی جو ارسلان کے زیر استعمال رہتی تھی، گیراج میں کھڑی تھی۔ ارسلان کے ذریعے اسے معلوم

نے سنجیدگی سے حالات کی سنگینی کا ادراک کیا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا تھا کہ اس ملک میں ”ان فیئرمینز“ ہر مرحلے پر کامیابی نہیں دلاتے۔ کبھی شکست بھی مقدر بن جاتی ہے..... کبھی کبھی تمام ذرائع رکھنے کے باوجود بہترین اثر و رسوخ کے مالک بھی قابو آ جاتے ہیں۔ شاید یہی مکافات عمل ہے.....!

کیا وہ مکافات عمل کا شکار تو نہیں ہونے جارہی؟

اس نے سوچا اور لرز کر رہ گئی۔

اچانک ہی کچھ سوچ کر اس نے سجاد خان کو فون کیا تھا۔ یہ سجاد خان کا خصوصی نمبر

تھا جس کا علم شاید نجمہ کے علاوہ بہت کم لوگوں کو رہا ہوگا۔

”کیا بات ہے کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“ سجاد خان نے فون پر ہی اس کے تیور

پچاننے کا دعویٰ کر دیا۔

”ایک ضروری بات تھی.....!“

”شام کو ”شالون“ میں ملتے ہیں۔“ سجاد خان مختاط آدمی تھا۔

”میں چھ بجے آؤں گی۔“

”اوکے!“ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

○

ارسلان گہری نیند سو رہا تھا جب وہ گھر سے روانہ ہوئی۔ کار وہ خود ہی چلاتی ہوئی

شالون ہوٹل آئی تھی۔ اس فائیو سٹار ہوٹل میں سجاد خان کے لئے ایک کمرہ مستقل بک رہتا تھا۔

کمرے میں سجاد خان پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا۔

نجمہ بیگم کی سیاسی اور معاشرتی حیثیت کے پیش نظر یہ احتیاط لازم تھی ورنہ سجاد خان

نے خود سے معلق کسی سیکنڈل کی کبھی پروا نہیں کی تھی، لیکن وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ نجمہ بیگم کے ساتھ کسی

سیکنڈل کی خبر اخبارات تک پہنچے۔

ایسی کوئی بھی خبر اس کے بزنس اور خود اس کے لئے نقصان کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہ

عورت ملک کے ممتاز سیاستدان کی بیوی تھی جس کی آڑ میں اس نے ابھی لمبا شکار کھیلنا تھا۔

سجاد خان نے اس کی ساری بات بہت دھیان سے سنی۔ دو چار سوالات اس سے

”یہ میرا فرض ہے۔ تم اس کا جو بھی مطلب لو۔“ اس نے مسکرا کر ارسلان کی طرف دیکھا۔

○

دونوں خاموشی سے کھانے میں مصروف رہے۔ اس دوران ماحول کی یکسانیت سے اکٹا کر نجمہ بیگم نے اس کے ساتھ دوسرے موضوع پر بات شروع کر دی تھی۔ کھانا ختم ہو چکا تھا جب گھریلو ملازمہ نے ڈاکٹر کی آمد سے مطلع کیا۔ ارسلان کے نہ نہ کرنے کے باوجود مسز ملک نے ڈاکٹر کو اندر بلا لیا تھا۔ اس نے ارسلان کے جسم کا معائنہ کیا اور دو تین دوائیاں لکھ کر آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلا گیا۔

”میرے خیال سے تم کچھ دن ملک سے باہر گزار آؤ، اس طرح اس حادثے کو بھلانے میں بھی مدد ملے گی۔ میرا مطلب ہے اس ڈپریشن سے تو نکلو..... اور ہاں مطمئن رہنا جن لوگوں نے بھی یہ زیادتی کی ہے۔ میں انہیں زمین کی ساتویں تہہ سے بھی نکال لوں گی۔ تم سے زیادتی کر کے کوئی اس ملک میں بیخ نہیں سکتا..... ملک صاحب دارالحکومت گئے ہیں۔ آج دوپہر کی فلائٹ سے کل رات کو ان کی واپسی ہوگی۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے اس معاملے کو۔“

ارسلان نے ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر اس کے سپاٹ چہرے پر نظر ڈالی اور گردن جھکا لی۔

ایک بات کا اندازہ تو اسے ہو گیا تھا کہ اس نے نجمہ بیگم کو کچھ دیر ہی کے لئے سہی پریشان ضرور کیا تھا۔ شاید وہ اس سے زیادہ اپنے مستقبل کی فکر میں غلطاں تھا اور اب اسے کچھ دنوں کے لئے منظر سے ہٹانے کا سوچ رہی تھی۔

”یہ مدت طویل بھی تو ہو سکتی ہے مسز ارسلان۔“ اس کی چھٹی حس نے ارسلان کے کان میں سرگوشی کی۔

”ٹھیک ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ دیکھ لوں گا۔ اب بھاگے ہیں تو دونوں کے سامنے میدان ایک جیسا ہی ہوگا۔“ اس نے اپنی مردانگی کو خود ہی ہلکا کر دیا۔

”آپ میرے متعلق یقیناً بہتر فیصلہ ہی فرمائیں گی۔“ اس نے کہا۔

”تم لندن چلے جاؤ۔ ایک آدھ مہینہ گزار کر آ جانا۔“ نجمہ ملک نے کہا۔

ہوا کہ گاڑی مقامی تھانے میں موجود تھی۔ کاغذات چونکہ مسز نجمہ کے نام تھے اس لئے پولیس نے اس سے ہی رابطہ قائم کیا تھا اور کار سے قیمتی آلات نکالنے کے بعد یہ کہہ کر انہیں لوٹا دی کہ یہ کار نامعلوم مقام پر چھوڑ کر کوئی بھاگ گیا ہے۔

○

نجمہ بیگم کے بعد اب دوسری مسلسل چوٹ نے اسے تھلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک لاوا سا انتقام کی طرح اس کے اندر دھنکے لگا تھا.....!

اس نے آج پہلی مرتبہ سنجیدگی سے اپنے ماضی کا جائزہ لیا تھا اور اب ایک بچھتاوا اس کی جان کو آ گیا تھا۔

اس کا سب کچھ تو چھن گیا تھا..... اس کو تو اب تسلی دینے والا بھی کوئی نہیں رہا تھا۔ ”میں انتقام لوں گا۔ نجمہ بیگم تم سے اور..... اور.....“

نجانے وہ حالت جنون میں کیا کیا سوچتا رہا۔ جب نوکرانی نے اسے رات کا کھانا تیار ہونے کی اطلاع بہم پہنچائی۔

کھانے کی میز پر نجمہ بیگم اس کی منتظر تھی.....!

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ ملک صاحب بہت پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“ اس نے اپنی اور ملک صاحب کی تشویش ظاہر کی۔

”شکریہ!“ ارسلان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

ایک طنزیہ سی مسکراہٹ خود بخود اس کے ہونٹوں پر آ گئی تھی۔

”میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ تھوڑی دیر میں آتا ہی ہوگا۔“ اس نے بڑی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ ارسلان نے پلیٹ میں سالن انڈیلتے ہوئے کہا۔

”اپنے اطمینان کے لئے میں نے ضروری سمجھا۔ خدا نخواستہ کوئی گہری چوٹ نہ لگی

ہو۔“

”بہت خیال رکھتی ہیں آپ میرا!“ اس کے طنز کی کاٹ گہری تھی لیکن نجمہ مسکرا کر رہ گئی۔

گئی۔

مارکیٹ سے ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ سیدھا مختاراں بائی کے کوٹھے پر پہنچا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ تیار کیا تھا اس میں مختاراں اور اس کی بیٹی کی ضرورت قدم قدم پر پیش آتی۔ گو کہ اس کے ذریعے مختاراں نے گہری چوٹ کھائی تھی لیکن وہ کجروں کی نفسیات سمجھنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پیسے کے لوگ ہیں اور اب اس نے پیسہ لگا کر کمانا شروع کر دیا تھا۔

اتنے عرصے بعد اسے اچانک یہاں دیکھ کر مختاراں بائی کا چونکنا فطری بات تھی۔ ”سناؤ باؤ ارسلان! آج کیسے ادھر کا راستہ بھول گئے۔“ اس کے لہجے میں طنز اور شکوہ عیاں تھا۔

”بی بی! ہم کچی یاری نہیں لگاتے۔ تمہارے نقصان کی فکر میں دبلا ہو رہا ہوں اور دیکھ لینا اگر ایک کے دس کر کے واپس نہ لوٹائے تو.....!“ وہ سیدھا خاص کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

مختاراں بائی شاید عام حالات میں اس کا وجود برداشت نہ کرتی، لیکن آج کل جس مندے کا شکار وہ ہو رہی تھی اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتی تھی۔ اس بازار کا بھی عجیب دستور تھا کہ ایک مرتبہ جس کی شہرت خراب ہو جاتی، اس کا بھاؤ گرتا ہی چلا جاتا۔

اور اسی بھیاں تک روایت کا شکار ہوئی تھی مختاراں بائی اور اس کی بیٹی۔ شریقاں کا اٹھایا ہوا طوفان کہنے کو تو گزر گیا تھا، لیکن اس کی تباہ کاریاں اپنے مکمل وجود کے ساتھ یہاں موجود تھیں۔ اس بازار کے مستقل آنے والے تھے ہی کتنے۔ جب سے سختی شروع ہوئی تھی فصلی بیڑے تو تب ہی اڑ گئے تھے اور اب تو کوئی بڑے دل گردے کا مالک تماش بین ہی ادھر کا رخ کرتا تھا یا پھر وہ اٹھائی گیرے جو کبھی لمبا ہاتھ لگنے پر اس طرف آ جاتے تھے۔ پہلی قسم کے لوگ تو مختاراں بائی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ شریقاں اور اس کی لڑکیوں نے پولیس سے اپنی درگت تو بنوائی تھی لیکن مختاراں کے لئے ایسے کانٹ بچ دیئے تھے کہ اب وہ نازنین کے ذریعے کبھی ڈھنگ کی فصل نہیں کاٹ سکتی تھی۔

اب تو ڈیرے کے نوکروں نے بھی ایک ایک کر کے منہ موڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان حالات میں ارسلان کی دوبارہ آمد ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح تھی۔

”یہ پانچ ہزار رکھ لو۔ بھی لے ناغے کا جرمانہ بھی تو دینا ہی پڑتا ہے ناں..... نازنین کہاں گئی؟“ ارسلان کی آواز مختاراں کے کانوں میں رس گھول گئی۔ عین ان لمحات میں جب

”ٹھیک ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں دو تین روز گزار لوں۔ ابھی جسمانی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھئی میں تمہیں کوئی بھگ جانے کا مشورہ تو نہیں دے رہی۔ جب دل چاہے چلے جانا۔ میں تو صرف چہنچ کی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے ارسلان کی گردن میں بازو جمائل کر کے بچوں کی طرح اس کا گال تھپتھپایا۔

”شکریہ.....!! میں ذرا باہر چکر لگا آؤں۔ تازہ ہوا بھی میری صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔“

اس کی اس بات پر نجمہ بیگم قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

پیدل چلتا ہوا وہ گھر سے باہر مارکیٹ تک آیا تھا۔

اس دوران اس نے دل ہی دل میں عزم کر لیا تھا کہ اگر وہ گناہ کی اس دلدل میں پھنس ہی گیا ہے تو اسے خود کو اتنا مضبوط اور طاقتور بنانا ہے کہ وہ بھی سرمائے اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر ان مگر مچھوں سے ٹکرا سکے۔ میں ”پانڈی“ ہی کیوں بنوں؟ اگر پھیرا لگاتا ہی ہے تو ملازم بن کر کیوں مالک بن کر کیوں نہ لگاؤں۔ خطرہ تو دونوں صورتوں میں ایک جیسا ہی ہوگا۔ گرفتاری کی صورت میں اسے یہ کہنے پر کہہ دینا نہیں کسی اور کا ”مال“ لے کر جا رہا ہے کم سزا تو نہیں ملے گی۔ قانون کی نظروں میں تو وہ مجرم ہی ہوگا۔ خواہ مال اس کا ہو یا نجمہ بیگم کا.....!

لیکن.....!

نجمہ بیگم کا کیوں اس کا اپنا ہی کیوں نہیں..... وہ خود سجاد خان کیوں نہ بنے۔ سب کو اپنے قدموں میں کیوں نہ جھکائے۔ اگر بے ایمانی کا پیسہ ہی کسی کے اعلیٰ نسب بڑے اور معزز ہونے کا معیار ہے تو وہ خود سب سے بڑا بے ایمان کیوں نہ بن جائے۔ واہ ملک ارسلان! واہ ارسلان جٹ! ونڈر فل..... شاباش! اب آئے نہ بچو سیدھی راہ پر۔“ اس نے دل ہی دل میں اس شاندار فیصلے پر خود کو داد دی۔

اب اسے اپنے لئے فی الوقت کچھ مصنوعی سہارے درکار تھے۔ ان بیساکھیوں کے بل بوتے پر ہی وہ اپنے مستقبل کی مضبوط بنیادیں استوار کرنے چلا تھا۔

نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

اب اسے حوصلے اور جرأت سے آگے بڑھنا تھا۔ مسز ملک نے اس کے ساتھ ہی دو تین پروگراموں پر بات کی اور اسے فی الحال آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی۔

اس کی روانگی سے کچھ دیر بعد ہی ارسلان نے رضوی صاحب کو فون کیا۔

لیکن وہ حیران ہی رہ گیا جب اسے جواب ملا کہ اس نمبر پر کوئی مسٹر رضوی نہیں رہتے اور یہ تو کسی پرائیویٹ کمپنی کا نمبر ہے۔ اب اسے اس بات کی سمجھ بھی آ گئی تھی کہ اسے اغوا کر کے تشدد کا نشانہ کیوں بنایا گیا؟ شاید رضوی صاحب نے اس کے سر سے ”دست شفقت“ اٹھالیا تھا یا پھر وہ اس کے کس آفسر نہیں رہے تھے اور ان کے تبادلے کے بعد نئے آنے والے نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

معاملہ کچھ بھی رہا ہو، ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ اب اس کے اور انجینی کے درمیان رابطہ فی الوقت تو ختم ہو چکا ہے۔ یہ لوگ اسی طرح اچانک ہی تعلق قائم کرتے اور اچانک ہی غائب ہو جاتے تھے۔

عجیب انداز تھا کام کرنے کا۔

شاید اب ان لوگوں کو ارسلان کی ضرورت رہی بھی نہیں تھی یا پھر اس کی سیاسی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس سے پہلو تہی ہی مناسب جانی تھی۔

نھو گجر نے اسے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا۔

”ہم جسے ایک مرتبہ مل لیں اسے بھلاتے نہیں باؤ جی!“ اس نے اپنی مونچھوں پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اس وقت میں تمہارے پاس کسی حوالے سے نہیں آیا۔ صرف اپنے کام سے آیا ہوں۔ نھو! یہ میری اور تمہاری ”بزئس ڈیل“ ہے۔ میری خواہش ہے کوئی تیسرا ہمارے درمیان نہ آئے۔ تم پیسوں سے غرض رکھو اور میں مال سے۔ یوں بھی تم مال فروخت ہی کرتے ہو۔ یہی گارنٹی چاہئے ناں کہ گاہک اعتماد والا ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں تم جیسے چاہو اپنی تسلی کر سکتے ہو۔“

ارسلان نے لگی لپٹی رکھے بغیر مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ وہ نھو گجر کو سال

مختاراں بائی ”نہ نہ“ کرتے ہوئے نوٹ تھام رہی تھی نازنین کمرے میں داخل ہوئی۔

بازار ہی میں وہ کسی تقریب پر گئی ہوئی تھی۔ ارسلان کو..... وہاں دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ اپنی ماں کو اس کے ساتھ شیر و شکر ہوتے دیکھ کر اس نے ارسلان کے تئیں اپنا موڈ بدل لیا اور حسب سابق بڑے ناز و اداسے اس کا استقبال کیا۔

ارسلان کی آمد کی خوشی میں مختاراں نے استادوں کو انعام دے کر رخصت کر دیا تھا۔ یوں بھی آج سارے دن کی مصروفیت نے نازنین کو تھکا دیا تھا۔

رات دیر گئے تک تینوں باتیں کرتے رہے۔ پھر مختاراں بائی ارسلان اور نازنین کو تاش کھیلنے چھوڑ کر چلی گئی۔

علی الصبح نازنین کی تھکن خاصی اتر گئی تو ارسلان اسے ششے میں اتار کر اگلے ایک دو روز میں آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

○

صبح وہ ناشتے کی میز پر نجمہ بیگم سے پہلے موجود تھا۔ اس نے اپنا موڈ خوشگوار بنالیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وقت سے پہلے نجمہ بیگم کو ہوشیار ہونے کا موقعہ دے۔ ہر قدم اس نے پھونک پھونک کر اٹھانا تھا۔ اس نے ناشتے پر دوران گفتگو یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ ملک سے باہر جانے کے فیصلے پر بہت خوش ہے۔

”لیکن میری درخواست ہوگی اس مرتبہ مجھے باخبر رکھا جائے۔ میں دھوکے کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔“ اس نے نجمہ بیگم سے کہا۔

”نہیں! اس مرتبہ تم صرف انجوائے کرنے جا رہے ہو۔ صرف سیر کرنے۔“ اس نے حسب عادت بچوں کی طرح اس کا گال تھپتھپایا۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا مسز ملک۔ میں خوفزدہ نہیں ہوں لیکن میں باخبر ہونا چاہتا ہوں اور دوسری بات کہ اس مرتبہ میں خود خواہش رکھتا ہوں کہ خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ مسز ملک میں نے سنجیدگی سے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے اکاؤنٹس میں اضافہ کروں۔ زندگی بہت مہنگی ہو گئی ہے اور شاید مستقبل میں مجھے آپ ایسے محبت کرنے والوں کا تعاون بھی حاصل نہ رہے۔“

”آل رایت! اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو اس کا احترام ہوگا مسٹر ارسلان۔“ اس

اور.....!

دونوں میں معاملہ طے پا گیا۔ ارسلان نے رقم واپس ادا کر دی اور ”مال“ دوسرے ٹھکانے سے حاصل کرنے کی ہدایت مل گئی۔ دوپہر تک وہ مال سمیت گھر واپس پہنچ گیا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اگلے دو تین روز اس نے مسز ملک کے ساتھ معمول کے مطابق گزارے۔ اس درمیان ملک صاحب واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے ارسلان کے اغوا کو صوبائی حکومت کے کھاتے میں ڈال کر اسے محتاط رہنے کی تلقین کی تھی۔ اس کے اغوا کو مرکزی حکومت کے ہر قابل ذکر عہدے دار کے سامنے اپنے نمبر ٹانگنے کے لئے اس ظلم کی کہانی بھی سنا دی تھی اور یہ باور کروا دیا تھا کہ وہ مرکزی لیگ کے ساتھ اپنی دوستی کی بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں۔

ایک چھوٹے سے بیک میں اپنا مال بیک کروانے کی خدمت بھی اسے اسی شہر میں میسر آ گئی تھیں۔ پکنگ کرنے والے نے پیسے تو اچھے خاصے وصول کئے تھے اور ایک خصوص بیک تیار کر کے اس کے ہاتھ میں تھما دیا، لیکن ارسلان کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ اس استاد کے ہاتھوں کا تیار کردہ ”تھیلا“ آج تک نہیں پکڑا جاسکا۔ اس کے پاس یورپی کسٹمر کے ہر جوڑ کا توڑ پہلے سے موجود تھا۔ ”حساس کیرڈ“ سے لے کر ”کتوں“ تک کی دست برد سے تھیلوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اس استاد کو جرم کی دنیا میں سیاستدان کی حیثیت سے مانا جاتا تھا۔

○

یہ بیک بھی بڑی خاموشی سے اس نے اپنے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ اب اسے نجمہ بیگم کے بیک کا انتظار تھا اور تیسرے روز ہی یہ انتظار بھی ختم ہو گیا۔

”تیار کر لو۔ تم پرسوں رات کی فلائٹ سے جا رہے ہو۔ پہلے والے ایئر لیس ہی پر جاتا ہے۔“

”بائی دی دے۔ مسز ملک مجھے اس ٹرپ پر کتنا معاوضہ ملے گا؟“

اس کے اچانک سوال نے ایک مرتبہ تو مسز ملک کو بوکھلا ہی دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ چوکی۔

”میں نے بڑی سلیس اردو میں بات کی ہے مسز ملک۔ اس میں سمجھ نہ آنے والی تو کوئی

بات نہیں۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے ملا تھا جب ایک مرتبہ ملک صاحب نے کسی جیلے میں ہنگامہ آرائی کے لئے اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور ارسلان کو اس کے پاس بھیجا تھا۔ تھو ہیر وٹن کا مقامی بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا۔ ایک جہان جانتا تھا کہ وہ ہیر وٹن کا دھندا کرتا ہے، لیکن پولیس نہیں مانتی تھی کیونکہ پولیس کو اس کے خلاف ”ثبوت“ نہیں مل سکا تھا اور ہونہار اور قانون کا احترام کرنے والی پولیس کبھی کسی کے خلاف ثبوت حاصل کئے بغیر کارروائی نہیں کرتی تھی۔

ارسلان کو یہ علم تو نہیں تھا کہ اس کے بعد بھی ملک صاحب نے کبھی تھو کی خدمات حاصل کی ہوں، لیکن وہ کم از کم اس سے دوبارہ نہیں ملا تھا۔ آج جب اچانک وہ گاہک کے رڈپ میں تھو کے سامنے آیا تو چند لمحے کے لئے تھو بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی انگارہ نما آنکھوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور اسے دوسرے کمرے میں آنے کی ہدایت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

جہاں ارسلان اس سے بات کر رہا تھا، دو کلاشکوف بردار اس کے اکٹیل بائیں موجود تھے جنہوں نے مسلسل ارسلان پر نظر رکھی تھی۔ تھو کے بغلی کمرے میں جاتے ہی انہوں نے ارسلان کے لئے راستہ چھوڑ دیا جو اس کے تعاقب میں اندر داخل ہو گیا۔

”کیا چکر ہے؟ کوئی باہر کی پارٹی ہاتھ لگ گئی کیا؟“ تھو نے دوسرے کمرے میں جئے بہترین فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا، ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے اسے دوسرے صوفے پر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”چکر تو ایسا ہے۔ پارٹی وہاں جا کر ڈھونڈوں گا۔“ ارسلان نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”مشکل کام ہے بیٹا! وہاں کوئی ملک تمہاری پشت پر موجود نہیں ہوگا۔ نہ ہی ان ملکوں میں رشوت سے کام چلتا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس چکر میں نہ ہی پڑو تو بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری کے چکر میں آدھی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔“ اس نے ارسلان کو ٹٹولنا چاہا۔

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کروں گا۔ مجھے صرف مال چاہئے۔“

”میں خطرات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا برخوردار۔ اگر تم بھند ہو تو ٹھیک ہے بات کرو کتنا لوگے؟“

سزا بھی دینی تھی تو اس کا ابھی وقت نہیں تھا۔ سز ملک نے فی الوقت جھک جانا ہی مناسب سمجھا، وہ ٹوٹا نہیں چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن اتنے زیادہ نہیں تین لاکھ ہی مل سکتے ہیں۔“

”پانچ لاکھ سے کم نہیں سز ملک۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”خندہ کروا ارسلان۔ میرا تمہارا تعلق مالک نوکر کا نہیں، ہم دوست بھی ہیں۔“

”بزئس اپنی جگہ سز ملک اور دوستی اپنی جگہ۔“ اس نے لوفروں کی طرح آنکھ دبا تے

ہوئے کہا۔

تین چار منٹ کی سرکھپائی کے بعد نجمہ بیگم نے اندازہ لگایا کہ ارسلان اپنی بات پراڑ گیا ہے اور اب پیچھے نہیں ہٹے گا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اس نے پریشانی کے عالم میں یہ تیسرا مسلسل سگریٹ سلگایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر تم بزئس مین بنے پرتل ہی گئے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہے۔“ اس نے بلا آخر تھپتھپاڑ ڈال دیے۔

”سز ملک! میں آدھی پے منٹ ایڈوانس چاہوں گا۔ روانگی سے کم از کم چوبیس گھنٹے پہلے۔“ اگلا حملہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔

”تم جانتے ہو اگر میں چاہوں تو ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینکوا سکتی ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی نجمہ بیگم نے کہہ دیا۔ ضبط کا یارا نہیں رہا تھا۔

”جی ہاں، لیکن آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ اگر آپ جیل میں نہ گئیں تو خدا کے فضل سے آپ کو اتنی نیک نامی ضرور مل جائے گی کہ پھر شاید گاؤں میں واپس ضرور جانا پڑے جہاں سے آپ نے اپنی اس ہنگامہ خیز زندگی کا آغاز کیا تھا۔ سز ملک ڈوبتا ہوا آدھی بسا اوقات بڑے ماہر پیراک کو بھی اپنے ساتھ لے مرتا ہے۔ آپ مجھے انڈر ایسٹی میٹ کر رہی ہیں۔ میں نے سنوڈٹس پالیٹکس میں جھک نہیں ماری۔ جیسے ہی مجھ پر برا وقت آیا آپ کی تباہی کا آغاز ہو جائے گا۔ آپ کی کہانی مکمل تفصیلات کے ساتھ ملک کے ہر قابل ذکر اخبار اور رسالے میں شائع ہو جائے گی اور میں مرتا مرتا بھی آپ کو مجرم ثابت کر دوں گا۔ نجمہ بیگم یہ مت بھولے کہ آپ نے ملک صاحب کو بھی بلیک میل کیا ہے۔ اس کھیل میں ایک طوائف کے رول کو

”اوہو! خاصے ہوشیار ہو گئے ہو ایک ہی چکر میں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر دیکھا۔ ”خیریوں اچھی خبر ہے معاوضہ پہلے جتنا دو لاکھ۔“

”اور مال؟“

”وہ بھی پہلے جتنا۔“

”اس مرتبہ میں پانچ لاکھ لوں گا سز ملک۔“

”ک ک ک..... کیا مطلب ہے تمہارا؟ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ اس مرتبہ اس نے

چلا کر بات کی تھی۔

”بالکل نہیں بلکہ میرا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے۔ سز ملک یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس کا روبرو میں آپ میری جان خطرے میں ڈال کر ایک کروڑ کا منافع ہو رہا ہو اس سے مجھے صرف دو لاکھ ملیں۔ میں اب اتنا گد جا بھی نہیں ہوں۔“

”تم نشے میں ہو یا مذاق کر رہے ہو؟“ نجمہ بیگم اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں سیریس ہوں۔ یہ زندگی موت کا کھیل ہے۔ ممکن ہے آپ اسے مذاق سے زیادہ اہمیت نہ دیتی ہوں لیکن میرے لئے.....“

”ارسلان اپنی اوقات میں رہو۔ زیادہ اونچا اڑنے کی کوشش نہ کرو۔ تم نہیں جانتے کہ.....“ اس نے ارسلان کی بات کا ٹھٹھا چباتے ہوئے کہا، لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ارسلان نے کاٹ دی۔

”یہی مشورہ میں آپ کو دوں گا سز ملک۔ اوقات تو میری بہر حال آپ سے زیادہ ہے۔ اگر آپ کا اشارہ خاندان کی طرف ہے تو!“ اس نے پھاڑ کھانے والے انداز سے جواب دیا۔

سز ملک بڑی گھاگ عورت تھی۔ بڑی زمانہ ساز عورت۔ وقت کے تیور پہچاننے والی۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ ارسلان اب گد جا بننے کو تیار نہیں ہوگا۔ اس کی تمام تر دھمکیوں اور خوف کے باوجود ارسلان اس کے سامنے ڈٹ گیا اور ایسے بد کے ہوئے گھوڑے کو ایک مشاق گھڑ سوار کی طرح قابو کرنا تھا اسے..... یہاں سختی سے نہیں نرمی سے بات بنتی تھی۔ اگر اس نے ارسلان کو کوئی

تک کوٹھی میں ضروریات زندگی کا سارا سامان بچا دے۔

خالی گھر کی حفاظت کے لئے چوکیدار اسے پر اپرٹی ڈیلر کے توسط سے میسر آ گیا تھا۔ اب وہ اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرنے جا رہا تھا۔ وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ ابھی تک سب کچھ اس کی پلاننگ کے مطابق چل رہا تھا۔ اپنے وکیل دوست کے ذریعے اس نے اپنی موت کی صورت میں جائیداد اپنی بہن اور ماں کے نام منتقل کرنے کی وصیت بھی تیار کر کے اسے تھما دی تھی۔

○

اس مرتبہ وہ غیر ملکی ایئر لائن سے سفر کر رہا تھا۔

حسب سابق مسز ملک اسے ہوائی اڈے پر رخصت کرنے آئی تھی۔ اس مرتبہ بھی کسی نے اس کے سامان کو کھولنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس کا سامان تھا ہی کتنا۔ دو بیک جن میں ضرورت کے کپڑے اور رسالے اخبارات کے علاوہ مٹھائی موجود تھی جو وہ لندن میں موجود اپنے دوستوں کے لئے جا رہا تھا۔

وہ بڑا پراعتماد سفر کر رہا تھا۔ مسز ملک سے انتقام کی دھن نے اس کے ذہن سے سارا خوف نکال کر باہر پھینک دیا تھا اور وہ اطمینان سے آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

اس مرتبہ اس نے گرین چیلن کے بجائے ”ریڈ چیلن“ اختیار کیا تھا۔ تلاشی کے کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے اپنے بیک کھولا اور مٹھائی کا بڑا ڈبہ نکال کر نو جوان کسٹم آفیسر خاتون کے سامنے رکھ دیا۔

”محترم خاتون! میں دوسری دفعہ لندن آیا ہوں، لیکن مجھے علم نہیں کہ یہاں کھانے کی اشیاء لانے کی اجازت ہے یا نہیں۔ میں بزنس مین ہوں۔ مقامی دوست بعد تھے کہ ان کے لئے اپنے شہر کی مٹھائی ضرور لاؤں۔ میں نے سنا ہے کہ اکثر لوگ مٹھائی لے آتے ہیں، لیکن اپنے اطمینان کے لئے اسے ڈکلیئر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔“

کسٹم آفیسر خاتون جو شاید حال ہی میں اس سروس میں آئی تھی، اس کا پاسپورٹ کھول کر اندراج چیک کئے۔ مٹھائی کا ڈبہ کھول کر دیکھا، اسے ایک مشین سے گزرا کر اسے واپس کر دیا۔ ”اور تو کچھ نہیں ڈکلیئر کرنے والا؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

نظر انداز نہ کیجئے۔ ایک ایسی طوائف جس کو آپ نے دھوکا دیا۔ خدا کا شکر ادا کیجئے کہ میں نے معاملہ دوبارہ کھا ہے اور اس گھناؤنے کھیل میں آپ کے کردار کا اسے علم نہیں ورنہ وہ خاندانی طوائف ہے۔ آپ سے کہیں زیادہ داؤ پیچ جانتی ہے وہ اور اسے اپنی عزت بے عزتی کا بھی کوئی خوف نہیں۔ آپ نے میرے ساتھ دودھ ہاتھ کئے ہیں۔ میری اور اپنی محبت کو جنگ میں آپ نے بدلا ہے اور مسز ملک آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی عرض کر دوں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔“

ارسلان کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ سیسے کی طرح نجمہ بیگم کے کانوں سے دماغ میں اتر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے تم چیک لے لو۔“ اس نے ٹڈ حال ہوتے ہوئے کہا۔
”نہیں کیش۔ مجھے آج شام تک یا کل صبح تک کیش دیجئے۔“

○

مسز ملک کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب تک وہ پاگل کیوں نہیں ہوئی۔ اگلے روز ناشتے کی میز پر اس نے کیش اڑھائی لاکھ روپے ارسلان کو دے دیئے۔ اس نے نگاہ غلط انداز بریف کیس میں سجائے نوٹوں پر ڈالی اور شکریہ کہہ کر بریف کیس بند کر لیا۔
”گمن لو کہیں.....“

”نہیں مسز ملک۔ اپنے دھندے میں بے ایمانی نہیں چلتی۔ اس کا نقصان فریقین کو ہوتا ہے فریق کو نہیں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“ اس نے نجمہ بیگم کی بات مکمل ہی نہ ہونے دی اور کیش اٹھا کر باہر آ گیا۔

کار میں وہ اپنے بینک کی طرف جا رہا تھا۔ بینک میں موجود خطیر رقم کا بڑا حصہ اس نے نکلوالیا اور اب اس کا رخ ایک پر اپرٹی ڈیلر کی دکان کی طرف تھا۔

”شیخ صاحب! آپ نے کل جس کوٹھی کی بات کی تھی، میں وہ خریدنے کے لئے تیار ہوں۔“ اس نے اگلے روز اپنے اور شیخ صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کے حوالے سے کہا۔ دو گھنٹے کے اندر کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور بیس لاکھ کیش کی صورت شیخ صاحب کی تجوری میں منتقل ہو گئے تھے۔ کوٹھی کی چابی ارسلان کے پاس تھی۔ اس نے اپنے اس وکیل دوست کو جس کے ذریعے کاغذات مکمل ہوئے تھے، کچھ رقم اس ہدایت پر دی کہ اس کی لندن سے واپسی

”مسز ملک آپ کا مال پہنچ گیا ہے۔ مجھے باقی پے منٹ یہاں چاہئے۔“ اس نے چھٹتے ہی کہا۔

”تمہیں کس نے باقی پے منٹ دینے سے انکار کیا ہے۔ سلیم صاحب کل تمہیں ملیں گے وہ باقی ادائیگی کر دیں گے۔ ایسی بے ہودہ بات کے لئے ہی کیا تم نے فون کیا تھا؟“ مسز ملک نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”نہیں نجمہ بیگم صاحبہ۔ میں تو آپ کو ایک زبردست ”سرپرائز“ دینے جا رہا ہوں۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ انسان گرنے پر آئے تو پھر گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ مسز ملک جنگ کا آغاز تم نے کیا ہے اسے انجام تک میں پہنچاؤں گا۔“ جانے اس کے اندر نفرت کا لاوا کب سے پک رہا تھا۔

○

مارٹن نے ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ صرف یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ سلیم صاحب کل اس سے کسی بھی وقت ملیں گے۔ وہ گھر پر ہی موجود رہے۔ رات اس بنگلے میں کیرن اور ارسلان نے اکیلے گزاری تھی۔ ساری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس نے بہت بڑا جوا کھیلنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا جوا بھی ہو سکتا تھا، لیکن اب وہ اس کھیل کو ختم کرنے پر تل گیا تھا۔

جانے کس برے وقت نجمہ بیگم نے اس کی انانیت پر اتنا گہرا گھاؤ لگا دیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد کیرن شاپنگ کرنے بازار چلی گئی اور وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس نے سجادول خان اور نجمہ بیگم کو ایک دوسرے سے ٹکرا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کھیل میں اس کی جان بھی جاسکتی تھی، لیکن اب اسے اپنی جان کی پروا تھی ہی کب! دوپہر کے بعد سلیم خان بھی آ گیا۔

سجادول کی سلیم کے روپ میں یہ دوسری ملاقات تھی۔ اس نے بڑی گرجوٹی سے ارسلان سے مصافحہ کیا اور اسے ایک اور کامیاب پھیرالگانے پر مبارکباد دی۔

ارسلان دل ہی دل میں اس کی بہادری سے بہت متاثر تھا۔ اتنا رسوائے زمانہ شخص جس کی تلاش دنیا بھر کی پولیس کو تھی، یہاں کتنے اطمینان سے بہروپ بدلے بیٹھا تھا۔

”تھینک یو فار دس کمپلیمنٹ۔“ ارسلان نے کہا اور مٹھائی دوبارہ بیگ میں ڈال کر بائی کہہ کر اپنا راستہ ناپا۔

لاؤنج میں اس مرتبہ کیرن کی بجائے ایک سیاہ فام اس کے نام کی تختی تھا مے کھڑا تھا۔ ”خیریت رہی جناب؟ آپ نے دیر لگا دی!“ مائیکل نے تعارف ہونے کے بعد کار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ سیاہ فام نے اپنے تعارف مائیکل کے نام سے کروایا تھا۔

”میں ذرا سو گیا تھا۔“ ارسلان نے کہہ کر تہقہہ لگایا۔

سیاہ فام کا تہقہہ اس سے بلند تھا۔

خلاف توقع یہ شخص بڑا دلچسپ ثابت ہوا۔ دونوں خاصی بے تکلفی سے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ لیون پہنچنے تک مائیکل اس کا گہرا دست بن چکا تھا۔ اس کی عمر ارسلان سے کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں تھی۔ اس نے ارسلان کی خواہش پر اپنا رابطہ نمبر بھی اسے دے دیا تھا لیکن اس درخواست کے ساتھ کہ اس کا علم مسٹر مارٹن کو نہ ہونے پائے۔

کیرن ایک مرتبہ پھر اس کے استقبال کو کھڑی تھی۔ اس نے حسب سابق ارسلان کا استقبال بڑی گرجوٹی سے کیا اور اس نے گرجوٹی کا مظاہرہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک وہ نڈھال ہو کر پلنگ پر ڈھیر نہیں ہو گیا۔ اس نے ہتھرو نہ جانے پر معذرت کی تھی کیونکہ وہ ضروری کام کے سلسلے میں کہیں اور گئی تھی۔

مارٹن کی آمد رات دیر گئے ہوئی۔ دونوں ایک انڈین ریستورنٹ سے کھانا کھا کر واپس آئے تھے جب مارٹن وہاں پہنچا۔

تینوں باتیں ہی کر رہے تھے جب اچانک ارسلان کو یاد آ گیا۔ ان سے معذرت کرتے ہوئے اس نے اپنے شہر میں نجمہ ملک کا نمبر ملا یا تو مسز ملک کی بوجھل آواز سنائی دی۔ شاید وہ ابھی سو کر ابھی تھی کیونکہ اس وقت وہاں صبح کے چھ سات بجے تھے اور ارسلان جانتا تھا کہ مسز ملک کو دیگر بیگمات کے برعکس صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے۔

اس کی ایک یہی پرانی عادت تھی جو اس نے نہیں چھوڑی ورنہ تو اس نے اپنے ماضی کے سارے حوالے ختم کر دیئے تھے۔

”ہیلو!“ اس نے گلا کھنگارتے ہوئے کہا۔

اس نے میری فرینکفرٹ پر کھینچی تصاویر دکھا کر مجھے بلیک میل کرنے کی دھمکی دی اور کہا کہ اگر میں نے اس کا حکم نہ مانا تو ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزاروں گا۔

سلیم صاحب! میری جان تو عذاب میں پھنس گئی۔ دولت کس کو بری لگتی ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ آخر آپ جیسے شخص کو یہ عورت کب تک دھوکہ دے سکتی ہے۔ جب بھی بات آپ کے علم میں آئی وہ درمیان سے آرام سے نکل جاتی اور میں غریب خواہ مخواہ مارا جاتا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو بہر حال یہ بات بتا دوں گا۔ آج رات جب میں نے مسز ملک کو فون کیا تو اس نے مجھے تنبیہ کی کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہونا چاہئے، جس پر میں نے بھی سخت بات کہہ دی۔ اب خدا جانے میرا یہ عمل صحیح ہے یا غلط۔ میرے لئے تو جناب دونوں صورتوں میں موت ہی ہے، لیکن میں اتنا بے وقوف نہیں کہ آپ کو دھوکا دینے کا تصور بھی کر سکوں۔ شاید میرے بچ بتا دینے سے آپ میرے متعلق بہتر رائے قائم کریں۔“

ارسلان نے بالا خراپے ترکش کا آخری تیر بھی چلا کر نتیجہ تقدیر پر چھوڑ دیا۔ سجاد خان نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سگریٹ سلگایا اور اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ شاید کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نجمہ ملک سے اس کی جذباتی اور جسمانی وابستگی تھی لیکن اسے اپنا بزنس سب سے بڑھ کر عزیز تھا، جس کے بل بوتے پر وہ اپنے ملک کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا۔ یہ عورت تو اس کی توقع سے بھی بڑھ کر مکار اور ہوشیار ثابت ہوئی تھی۔ اس نے تو اس گلنگ کو بھی سیاست ہی سمجھ لیا تھا۔

اپنے سائل کے مطابق اچانک ہی وہ چلتے چلتے رک گیا اور گردن گھما کر ارسلان سے مخاطب ہوا۔

”چند روز پہلے تمہیں کس نے اغوا کیا تھا؟ کیوں اغوا کیا تھا؟“

ایک کونداسا اس کے ذہن پر لپکا اور اس نے ایک لمحہ تردد کے بغیر کہا۔

”خان صاحب یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ میں نے پچھلے چار پانچ سال میں سوائے اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے اور ڈھنگ کا کوئی کام کیا نہیں۔ جانے مخالف طلباء تنظیم کے لوگ کب سے اس موقع کے منتظر تھے۔ اس روز مجھے اکیلے پانچ انہوں نے قابو کر لیا اور میرے ساتھ وہی کیا جو ایک دشمن اپنے دشمن کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اپنی دانست میں تو انہوں

”کیا بات ہے بھی مسز ملک کو آپ سے شکایت کیوں رہنے لگی ہے؟ کیا معاملہ ہے شاید ہم کوئی مدد کر سکیں۔“ اس نے اچانک ہی ارسلان کو مخاطب کیا۔

اس کا مطلب تھا کہ مسز ملک نے اس سے بات کر دی ہے۔ اس نے سوچا اور پھر تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

”ان کی ناراضگی بالکل بے جا ہے سلیم صاحب۔ اصل میں یہ اصول کی بات ہے اور اصولوں پر اختلاف ہو جایا کرتے ہیں۔ میں خود چاہتا تھا کہ آپ سے بات کروں، لیکن اس سے پہلے آپ نے چونکہ خود ہی اس طرف اشارہ فرما دیا تو مجھے حوصلہ ہوا اور نہ آپ جیسے بڑے آدمی سے تو بات کرنے کی ہمت مجھ میں پیدا نہیں ہو رہی تھی۔“

سجاد خان ٹکٹکی باندھے بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ٹکٹکی وہاں کچھ تلاش کر رہا تھا لیکن ارسلان بھی کمال کا اداکار تھا۔ کیا مجال جو اس کی آنکھوں یا چہرے کے تاثرات سے سجاد خان کو کچھ بھی اندازہ ہو سکتا۔

بڑے ڈرامائی نمائنداز میں اچانک ارسلان اپنی جگہ سے اٹھا اور لمحہ کمرے سے دوسرا بیگ اٹھا لیا۔ اس نے بیگ سجاد خان کے سامنے رکھ دیا۔

”کیا ہے یہ؟“ سجاد خان کو الجھن سی ہونے لگی۔

”میرے اور مسز ملک کے درمیان ناراضگی کا سب سے بڑا سبب۔ سلیم صاحب میں آپ کو جانتا ہوں اور مجھے نجمہ کی حیثیت کا بھی علم ہے۔ ایسی جانے کتنی عورتیں آپ کے تلوے چاٹتی ہوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی خطرہ رقم آپ کے سبب دیکھی تھی۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ جب آپ ایمانداری سے مجھے میرا حق دے رہے ہیں تو میں آپ کے ساتھ بے ایمانی کیوں کروں۔ جب مسز ملک نے مجھے یہ بیگ دیا تو میری چھٹی حس نے کہا جیسے وہ مجھے آپ کو بے خبر رکھ کر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اپنے عندیے کا اظہار اس کے سامنے کیا تو اس نے صاف بتا دیا کہ واقعی یہ اس کا مال ہے اور اس ڈیل سے آپ کا تعلق نہیں۔ اس نے مجھے کہا۔ ارسلان! میں سجاد کی پانز ہوں، کوئی غلام نہیں۔ وہ دراصل مجھے قربانی کا بکرہ بنا کر اپنا الو سپدھا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے یہ بیگ دے کر کہا کہ اس مال کی فروخت کے لئے میں گاہک خود تلاش کروں اور سجاد خان سے ہٹ کر ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔ جب میں نے انکار کیا تو

تھیں اور اب ایک تھیلی کھول کر اس نے انگلی سے اس میں مواد کو چکھا۔ پھر باری باری پانچوں تھیلیوں کے مواد کو چکھ کر اثبات میں گردن ہلا دی۔
 ”فائن“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جاؤ!“ اس نے مارٹن سے کہا اور وہ وفادار کتے کی طرح دم ہلا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سجاد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سامان کی قیمت کا اندازہ لگایا اور اس کی طرف مخاطب ہوا۔

”اس نے کیا اندازہ لگایا تھا اس کی قیمت کا؟“

”مجھے صرف یہ کہا گیا تھا کہ گاہک بناؤ اور فی الوقت جو بھی قیمت ملے وہ لے لوں۔“
 ارسلان نے بغیر سوچے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ آج سے میری تمہاری دوستی پکی۔ بہادر اور ایماندار لوگوں کو اس وقت تک پسند کرتا ہوں جب تک وہ بے ایمان نہ بن جائیں۔ تم نے اگر خوفزدہ ہو کر بھی سچ بولا ہے تو بھی تمہارے سچ کی قدر کرتا ہوں۔ فی الوقت تم اسے کسی بات کی ہوا نہ لگنے دینا۔ اسے یہی باور کروانا کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوا ہے۔ اس بات کا پتہ لگانا تمہارا کام ہے کہ وہاں اپنے ملک میں وہ بال کس سے لیتی ہے۔ اسے قابو میں رکھو۔ جیسے وہ کہے کرتے رہنا۔ اس نے فریلفٹ میں تصاویر بھی مجھے لاعلم رکھ کر اتروائی ہیں۔ میں اتنا گھٹیا انسان نہیں کہ اپنے جان نثاروں کی بلیک میلنگ شروع کر دوں۔ میرے لئے کوئی خطرے کا باعث نہیں بن سکتا کیونکہ میں نے کبھی کسی کو بزنس پارٹنر نہیں بنایا۔ تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر ادائیگی ہوگی۔ اس دنیا میں ہر کسی کو ترقی کرنے کا آگے بڑھنے کا حق ہے لیکن مجھے کچل کر میرا ہی کوئی کارندہ آگے بڑھے یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ میں خود تمہارا یہ مال سیل کروا رہا ہوں۔ تمہیں باقاعدہ اور الگ پارٹی کی حیثیت سے ملوؤں گا۔ گو کہ وہ میرے ہی لوگ ہیں لیکن تم مجھے کوئی باور کرانا کہ تم نے اس کے لئے الگ سے گاہک بنایا ہے۔“

”شکریہ جناب! آپ نے مجھے اس قابل بنانا۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں بھی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ کو دھوکہ دے کر نہیں۔ ممکن ہے نجمہ بیگم

نے مجھے مار ہی ڈالا تھا۔ رات کو شاید کمپنی باغ میں پھینک گئے تھے جہاں سے اٹھ کر میں پھر گھر چلا آیا لیکن آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے اس حادثے کی خبر اخبارات کو نہیں دی۔ میں تو سنوڈنٹس پالیٹکس سے علیحدگی اختیار کر چکا ہوں۔ آپ جانتے ہیں جناب اس میں سوائے ذلت کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ مجھے ملک صاحب کا آلہ کار بن کر جینا بھی پسند نہیں۔ جب خطرے کو سینے سے لگایا ہے تو پھر میں اپنی مرضی کی زندگی کیوں نہ جیوں۔“

اس نے اپنی جب زبانی کا زبردست مظاہرہ کر کے سجاد خان جیسے بین الاقوامی سنگلر کو بھی گڑبڑا کر رکھ دیا تھا اور وہ بھی چکر اکر رہ گیا تھا۔

سجاد خان سوچ رہا تھا کہ نجمہ نے اس کے ساتھ کتنا دھوکہ کیا۔ پہلے اسے بے وقوف بنانے کے لئے ارسلان کے سیکورٹی کے ہاتھوں اغوا کی کہانی گھڑ دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ سیکورٹی والے اس سے مار مار کے نجمہ بیگم کے دوسرے بزنس کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس نے اپنے ذرائع سے ہر ممکن طریقے سے پتہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ ارسلان کو کس نے اغوا کیا اور اس کے ذرائع نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ اسے کسی سرکاری ایجنسی نے اغوا نہیں کیا اور اگر وہ ارسلان کو اغوا کرتے بھی تو ایک رات ہی اپنے پاس رکھ کر واپس کر دیتے؟
 اس کے ایک دو دوستوں سے اشارتا اسے کہا تھا کہ اس عورت سے بچ کر رہے کیونکہ یہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اپنے راستے میں آنے والی کسی بھی دیوار کو گرا دے گی۔

لیکن اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ سانولے بدن والی یہ عورت جو بلا کی سگریٹ نوش تھی ایک دن اس پر بھی اپنا داؤ لگانے کی فکر کرے گی۔ اس نے زندگی میں کسی کو آدھے حصے کا پارٹنر نہیں بنایا تھا۔ وہ خود میدان کا شیر تھا اور ساری زندگی اس نے اکیلے ہی شکار کھیلا تھا۔ یہی اس کی کامیابی کا راز بھی تھا۔

○

جیسے جیسے سجاد خان ٹہل رہا تھا ارسلان کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے اترنے لگے تھے جب اچانک سجاد خان نے رک کر دوسرے کمرے سے مارٹن کو آواز دی۔ اس نے میز پر رکھے بیگ کی طرف دیکھ کر مارٹن کو مخصوص اشارہ کیا اور اس نے گردن ہلا کر بیگ کو کھولنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس نے پانچ تھیلیاں نکال کر میز پر رکھ دی

آٹھ دس روز تک اس نے دیار فرنگ کے مزے لوٹے۔ پھر وطن لوٹ آیا۔ مسز ملک خلاف توقع اسے خود لینے ایئر پورٹ پر آئی تھی۔ وہ ارسلان کے منہ سے اس ”سر پرانز“ کی تفصیلات سننے کے لئے بے چین تھی جو وہ اسے دینے جا رہا تھا۔

○

گھر پہنچ کر اس نے چائے پی اور ڈرائنگ روم میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ مسز ملک کی بے چینی کا اظہار اس کی مسلسل سگریٹ نوشی سے ہو رہا تھا۔

”میں آپ کو زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا مسز ملک! دراصل گزشتہ تین چار ماہ میں میں نے زندگی کے اتنے بھیاں تک روپ دیکھے ہیں کہ شاید ساری زندگی دوبارہ نہ دیکھ پاؤں۔ یہ تو آپ بھی تسلیم کریں گی بیگم نجمہ کہ انسان تجربے سے سیکھتا ہے۔ میں نے بھی سیکھا کہ اس ملک میں عزت بڑائی اور منصب کا واحد معیار دولت ہے۔ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہے وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہے۔ اپنی جان پر کھیل کر میں جو کام کر رہا ہوں، گو کہ اس کا معاوضہ مجھے اتنا زیادہ ملتا ہے جس کی توقع بھی میں نے زندگی میں کبھی نہیں کی تھی، لیکن سوچتا ہوں کہ جب بازار میں بیٹھ ہی گئے تو پھر گھونگھٹ کیسا..... مسز ملک! میں نے تو پچھلے پھیرے پر ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگلی مرتبہ اپنے اور آپ کے لئے کوئی کارنامہ ضرور انجام دوں گا..... مسز ملک جب میں سجاد خان کا مال لے کر جاتا ہوں تو ہم دونوں اپنا سائیڈ بزنس آخر کیوں نہیں کر سکتے۔ اس کی آڑ میں ہی سہی اور اس پر اصولاً اسے کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔ حالانکہ یہ معاملہ کبھی اس کے علم میں نہیں آئے گا.....! ٹھہریئے“

اس نے نجمہ بیگم کو بے چینی سے کر دھت بدلتے دیکھ کر کہا۔

”میری پوری بات سننے کے بعد ہی آپ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گی۔ مسز ملک! میں اپنے ساتھ ہیر وڈن کی تھوڑی سی مقدار الگ سے بھی لے گیا تھا..... اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ میں نے سجاد خان اور اس کے کارندوں کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی اور..... پارٹی الگ سے کھڑی کر لی۔ مسز ملک دس ہزار روپے کے دس لاکھ..... آدھے آپ کے آدھے میرے۔ کیونکہ میں آپ سے پانز شپ کے بغیر کوئی کام نہیں کروں گا۔ آپ کو غصہ تو آیا ہوگا جب اس مرتبہ میں نے آپ سے زندگی میں پہلی مرتبہ اس طرح پیسوں کی بات کی، دراصل وہ پیسے تب میری ضرورت تھے۔ آج

کی اس اچھی حرکت نے کہ وہ مجھے بلیک میل کر کے اپنا بندہ بے دام بنانا چاہتی ہے مجھے جذباتی کر دیا ہو اور اس سچ کے پیچھے میرے انتقام کا جذبہ بھی کارفرما رہا ہو، لیکن یہ بات نہ بھی ہوتی تو بھی میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا خطرہ کبھی مول نہ لیتا۔“ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

”انجوائے یور سیلف.....! پھر ملاقات ہوگی۔ رقم یہاں یا وہاں جہاں بھی چاہو وصول کر لینا۔ گڈ لک..... گڈ ڈے۔“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اس کی روانگی کے بمشکل تین چار منٹ بعد ہی مارٹن اندر آیا۔ اس نے میز پر دھری پڑیاں سلپے سے بند کیں اور انہیں ایک بڑی تھیلی میں ڈال کر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لیسٹر جا رہے تھے۔ لیسٹر کے ایک پر تکلف ہوٹل میں اس کی ملاقات ایک ایشیائی سے کروائی گئی جس نے اپنا نام بھی بتایا تھا، یہی ان کا نیا گاہک تھا۔ ساٹھ لاکھ میں اس نے مال اٹھالیا تھا اور ادائیگی ارسلان نے اپنے ملک سے لینی تھی۔ اس کو کسی غیر ملکی کرنسی کے نوٹ کا ایک ٹکڑا دے دیا گیا۔ یہ ٹکڑا اس کو اپنے ملک میں ایک شخص کو دکھا کر اس سے رقم وصول کرنی تھی۔ بھٹی نے اسے اپنا رابطہ نمبر اور آئندہ کے لئے کھلا مال خریدنے کی پیشکش کر دی تھی۔

ارسلان کے دل میں خوشی سے لٹو پھوٹ رہے تھے۔ فی الوقت تو معاملات اس کی مرضی کے مطابق ہی طے پا رہے تھے اور اسے امید تھی کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح تیزی سے بھاگتا چلا جائے گا۔

ہوٹل سے باہر آ کر اس نے فون کارڈ حاصل کیا اور انٹرنیشنل بوتھ سے مسز ملک کو فون کیا۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے مسز ملک کہ آپ نے میرے معمولی مذاق کا اتنا برا منایا۔ میں نے جس ”سر پرانز“ کا ذکر کیا تھا اس کی تفصیلات جان کر آپ میرا منہ چوم لیں گی، لیکن میں فون پر کچھ نہیں بتاؤں گا۔ باقی بات آنے پر ہی ہوگی۔ اس وقت تو میں نے آپ کی ناراضگی ختم کرنے کے لئے فون کیا تھا۔“

اس سے پہلے کہ مسز ملک کچھ کہے، اس نے اپنی صفائی پیش کر کے اسے مطمئن کر دیا۔

”مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی تمہیں آج کل کیا ہو گیا ہے۔ خیر کوئی جلدی نہیں جب دل بھر جائے تب اطمینان سے آنا۔“

”شکریہ! امید ہے کہ آپ ناراض نہیں ہوں گی۔ خدا حافظ۔“

رہے ہیں۔

یہاں سے اٹھ کر وہ سیدھا مختاراں بائی کے ڈیرے پر آیا تھا۔ اس کے وکیل دوست نے کوٹھی کے فرنیچر اور ضروریات زندگی کے سبب جانے کی اطلاع اسے پہنچادی تھی۔ مختاراں کی تو باچھیں اسے دیکھتے ہی کھل گئیں۔ ماں بیٹی کے لئے وہ لندن سے جو تحائف لایا تھا وہ ایک ایک کر کے اس نے دونوں کے سامنے رکھ دیئے۔ ماں بیٹی اس کی ہر ہر ادھر پر قربان ہوتی جا رہی تھیں۔

”بی بی! ابھی اصلی چیز تو تم نے دیکھی ہی نہیں۔ آؤ میرے ساتھ.....!“ اس نے ماں بیٹی کو اشارہ کیا۔

”کہاں؟“

”ابھی بتاؤں گا نہیں۔ بس دیکھو گی تو یقین نہیں آئے گا۔“

حیران ماں بیٹی کو اس نے گاڑی میں بٹھایا اور سیدھا اپنی کوٹھی پر لے آیا۔ چونکدار نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی دروازہ کھول دیا۔ مختاراں کی تو آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”باؤاارسلان! یہ ہمیں کہاں لے آئے ہو؟“ اس نے شاندار اور سامان تعیش سے بچے سجائے ڈرائنگ روم کے قیمتی صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تھا ناں کہ بی بی ذرا صبر کرو۔ سارے دھونے دھودوں گا۔ بی بی! یہ میرا گھر ہے بلکہ میرا نہیں تمہارا..... ہاں یہ اب تمہارا گھر ہے.....!“

مختاراں حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اس نے فلموں میں تو ایسا کچھ ہوتے دیکھا تھا، عملی زندگی میں بھی ایسا ممکن ہے؟ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

”تم ذرا کچن میں جا کر چائے بناؤ۔ میں بی بی سے ضروری بات کر لوں۔“ اس نے نازنین کو اشارہ کیا۔

اس کے ساتھ ہی مختاراں نے آنکھ دبا کر نازنین کو اٹھ جانے کی تلقین کی۔

”دیکھو بی بی! میں تم سے بہت دنوں سے بات کرنے کی سوچ رہا تھا۔“ نازنین کے جاتے ہی اس نے مختاراں سے کہا۔ ”لیکن میں ہوا میں باتیں کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ یوں بھی آدی تجربے سے ہی سیکھتا ہے اور تم جانتی ہو کہ میرے ساتھ تصویروں والے معاملے میں کیا دھوکہ ہوا۔ خیر! اس کا الزام تو ہو جائے گا۔ فی الوقت میں نے تم سے یہی کہنا تھا کہ اب تم اپنا کٹھا چھوڑ دو

میں ڈیل کر کے منافع کے ساتھ لوٹا ہوں۔“

اس نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ کر نجمہ بیگم کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ ہوس کی ماری نجمہ بیگم کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی تھی کہ اسے پھر سبائوں کے اندھے کی طرح ہر طرف ہر اہی ہر ادکھائی دینے لگا۔

”لیکن ارسلان..... خطرہ بہت ہے۔ اگر کبھی سجاد کو علم ہو گیا تو وہ بڑا ظالم آدمی ہے۔“ اس نے اتمام جہت کے لئے کہہ دیا۔

”چھوڑیئے نجمہ صاحبہ! اولاً تو آپ کی زلفوں کے کسی اسیر کی جرأت ہی نہیں کہ آپ کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھے۔ پھر اسے علم ہو گا ہی کیوں اور اگر ہوا بھی تو بے فکر رہے۔ میں مرتا مر جاؤں گا! آپ کا نام کبھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔“ اپنی بات کے خاتمے پر اس نے خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

”گدھے کہیں گے۔ یہ یورپ نہیں۔ خیال رکھا کرو۔“ نجمہ بیگم نے آہستگی سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

چڑیا اس کی سکیم کے عین مطابق اس کے جال میں پھنس گئی تھی۔

”اب میں دیکھوں گا مسز ملک کہ کون کسے بلیک میل کرتا ہے۔“ وہ دن ہی دل میں

مسکرا دیا۔

○

صبح اس نے نجمہ ملک سے تفصیلاً ساری بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ اگر ایک دو کامیاب چکر بھی لگ گئے تو وہ دونوں ہی کروڑ پتی بن جائیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو گی۔ اس نے نجمہ بیگم کو باور کروانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اگر چاہے تو سجاد خان سے بڑا اپنا بزنس قائم کر سکتی ہے اور اپنے ملک ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں اپنے دفتر بھی کھول سکتی ہے۔

نجمہ بیگم نے یوں تو ہر بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتی جا رہی تھی کہ سجاد خان سے بچ کر رہنا۔

”مسز ملک ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کرنے جا رہے۔ کیا وہ بھی پہلے دن ہی ایسا تھا؟ اس نے بھی اپنا اشارت ”پانڈی“ کی حیثیت سے کیا تھا اور آج درجنوں لوگ اس کے لئے کام کر

صاحبزادی کے گانے سے ہی دل بہلانے چلے آتے تھے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ بازار کی سیانی بانیاں جیسے ہی کوئی کام کا گاہک ملتا، ماہوار پر اپنی بچوں کو ان کے ہاں بٹھارہی تھیں۔

ارسلان کی پیش کش شاندار تھی۔

اگر کوئی وسوسہ اس کے دل میں تھا تو وہ ماضی کے حوالے سے..... لیکن وہ بھی ارسلان نے ثابت کر دیا تھا اس نے جان بوجھ کر دھوکا نہیں دیا بلکہ وہ خود دھوکے میں مارا گیا۔ اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد ارسلان کی پیشکش قبول کر لی اور پانچ چھ روز میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر دونوں ماں بیٹی یہاں منتقل ہو گئیں۔ دونوں کران کی خدمت کے لئے موجود تھے۔ کوٹھا اچھے کرائے پر اٹھ گیا تھا۔ بازار والوں کو اس نے اپنے نئے ایڈریس سے ابھی آگاہ نہیں کیا تھا۔

اب ارسلان کے کھیل کا دوسرا سین شروع ہونے والا تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اب اپنے گھر ہی میں بسر کرتا تھا۔ ملازموں کے نزدیک ان کی حیثیت ایک خاندان کی سی تھی۔ یوں بھی یہ کوئی بہت زیادہ سمجھدار ملازم نہیں تھے کہ ان کی تحقیق کرتے پھرتے وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔

○

لندن میں بھٹی کے پاس جو مال اس نے فروخت کیا تھا، وہ رقم اسے یہاں وصول ہو گئی تھی۔ جسے اس نے کمال ہوشیاری سے مختلف کمپنیوں میں سرمایہ کاری کی نذر کیا تھا۔ اب وہ بجا طور پر خود کو کروڑ پتی کہلا سکتا تھا۔

اس روز جب اس نے مسز ملک سے اگلے چکر کی بات کی تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مسز ملک کو ابھی اتک سجال خان کی طرف سے کوئی ایسا تاثر نہیں ملا تھا، جس سے وہ اندازہ کر سکتی کہ سجال خان اس کے تئیں بدظن ہو گیا ہے۔

اس مرتبہ اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ ارسلان سے کہو تھوڑا انتظار کرے، لیکن اس اطلاع نے کہ وہ کسی دوسرے پاسپورٹ پر سفر کر رہا ہے اسے مطمئن کر دیا تھا۔

”اور اپنے مال کی فکر بھی ابھی سے کیجئے۔“ اس نے مسز ملک سے کہا۔

”ہاں۔ تم آج ”شو“ کے سے مل لو۔ سارا بندوبست وہ کر دے گا۔“ مسز ملک نے

جواب دیا۔

اور یہاں منتقل ہو جاؤ۔ دس ہزار روپے مہینے کا خرچ بندھا ملتا رہے گا۔ وہاں بازار میں مکان کرائے پر چڑھا دو..... مختار ابائی! میرا پروگرام نازنین کو بہت اونچا لے جانے کا ہے۔ یوں بھی اب بازار میں تمہاری شہرت کچھ اچھی نہیں رہی اور حکومت نے اس کام پر جو سختی شروع کی ہے تو دیکھ لینا کہ اب کوئی ہمت والی ہی کوٹھا سجائے گی۔ میں نے نازنین کو اس گندگی سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کوٹھی اس کے نام لگا دوں گا اور ساری زندگی عیش کرے گی۔ آگے تمہاری مرضی۔ زبردستی کوئی نہیں، سوچ سمجھ لو۔ ایک طرف وہی بازار کی ذلالت اور دوسری طرف باعزت زندگی۔ یہاں دو تین نوکر رکھ لو اور عزت سے زندگی بسر کرو اور اس میں دھوکے والی بات بھی کوئی نہیں۔ بازار والا گھر تمہارے قبضے ہی میں رہے گا۔ کون سا بھاگا جا رہا ہے۔“

اس نے پوری تیاری اور ہوشیاری کے ساتھ سنہری جال اس بوڑھی مچھلی پر پھینک دیا اور مختاراں اس جال میں پھنس گئی۔ حالات نے ارسلان کو بڑا ماہر نفسیات بنا دیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں مختاراں کا بزنس نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ یوں بھی اب بازار صرف نام کا ہی بازار حسن رہ گیا تھا۔ رات بھر میں بمشکل دو گھنٹے بازار کھلتا تھا۔ اس درمیان پولیس کی اتنی نفری وہاں ہوتی تھی کہ عام آدمی تو وہاں جاتے ہوئے بھی خوف زدہ رہتا تھا۔ حیلوں بہانوں سے پولیس ہر طرح اس طرف آنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتی تھی۔

یوں تو کسی قسمت والی بائی کے کوٹھے پر ہی اس دو گھنٹے کے وقفے میں کوئی گاہک آتا تھا۔ اگر کوئی آ ہی جاتا تو پولیس والے بھی اس کے تعاقب میں دھڑ دھڑ کرتے سڑکیاں چڑھ کر اوپر چلے آتے۔ نئے ایس پی نے تو ان لوگوں کا ناٹھہ بند کر رکھا تھا۔ کوئی ایسا کوٹھا نہیں تھا جس پر شراب نوشی یا جسم فروشی کا مقدمہ نہ بنا ہو۔ کنجروں نے ہڑتال کر کے دیکھ لی تھی۔ رشوت اور اثر و رسوخ آزمایا تھا۔ اپنے تمام ذرائع استعمال کر کے دیکھ لئے تھے..... سمجھدار بانیاں اپنے کوٹھے کرائے پر چڑھا کر شہر کی نئی آبادیوں میں رہن بے را کر رہی تھیں۔ اگر کوئی چوری چھپے جسم فروشی کا دھندہ کر رہی تھی تو اس کا گزارہ تو ممکن تھا، لیکن خاندانی طوائفوں پر برا وقت آیا تھا اور صرف ناچ گانے سے اب زندگی کی گاڑی گھیننے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

یہ سارے حالات مختاراں ابائی جیسی گھاگ اور زمانہ ساز طوائف کی نظروں سے اوجھل نہیں تھے اور نئے حالات میں اب وہ خاندانی تماش بین بھی کم ہی نظر آتے تھے جو اس کی

کام کا بندہ ثابت ہوا تھا۔ جو کچھ وہ سوچ نہیں سکتی تھی وہ کچھ دہ کرنے جا رہا تھا۔ یہ تو اس کے لئے چونکا دینے والی اور حیرت انگیز خبر تھی۔ احتیاطاً اس نے خود ایئر پورٹ پر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن.....!

تینوں جہاز پر بغیر کسی روک ٹوک کے پہنچ گئے تھے۔

ارسلان نے جدید فیشن کے مطابق داڑھی بڑھائی تھی۔ چہرے پر خوبصورت فریم کی عینک لگائی تھی اور وہ اس روپ میں ایک اور پاسپورٹ پر تصویر بدل کر سفر کر رہا تھا۔ کیا مجال جو اس کی بدلی ہوئی حالت کی طرف ایک لمحے کے لئے بھی مختاراں کا خیال گیا ہو۔

ایمسٹرڈم تک انہوں نے اپنی آنے سانسے کی سیٹ پر بیٹھی فیملی سے اچھی خاصی دوستی کر لی تھی۔ لوگوں کو لہانے کے انداز تو ماں بیٹی کو خوب آتے تھے۔ ایمسٹرڈم پر ٹرانزٹ میں پہنچ کر اس نے دونوں کو دکھانے کے لئے ایک جعلی فون کیا، پھر منہ لٹکائے واپس آ گیا۔

”بی بی! تم آدھ گھنٹے میں لندن پہنچو۔ میں شام تک آؤں گا۔ بے فکر رہنا، گھبرانا نہیں۔ وہاں تمہیں لینے کے لئے میزبان آئے ہوں گے۔ اچھا اب چلو، وہاں تمہارے نام کی تختی لئے کوئی کھڑا ہوگا۔ گھبرانا نہیں..... ہاں.....!“

اس سے پہلے کہ انہیں کچھ سمجھ آتی، جہاز کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔

”بھائی صاحب! مجھے ایک ایمر جنسی کی وجہ سے یہاں دو گھنٹے رکتا پڑے گا۔ آپ برائے مہربانی میری مسز اور ان کی مدد کو ہتھ پر گائیڈ کرتے رہیں۔“

اس نے مختاراں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنے ہم سفر سے کہا۔

”آپ گھبرائیں نہیں آئی، ہم ہیں ناں۔ ہمارے ساتھ ہی چلیں..... بلکہ آپ

ہمارے مہمان رہیں پلیز۔ ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ ہم سفر نو جوان خاصا ہمدرد دکھائی دے رہا تھا۔

”اچھا بیٹا! لیکن جلدی آ جانا۔ نازنین کا دل بہت گھبرائے گا۔“

مختاراں نے گھبراہٹ میں ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ ہم سفر نو جوان نے اسے چلنے کے لئے کہنا شروع کر دیا تھا۔

”خدا حافظ۔“ اس نے نازنین کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”اس مرتبہ دو بیک تیار ہوں نجمہ صاحبہ!“

”کیوں؟“

”ابھی آپ یہ بات نہ پوچھیں۔ صرف میرا کام دیکھیں۔ میں زیادہ عرصہ اس دھندے میں رہنا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس حوالے سے شہرت کماؤں دولت کی البتہ الگ بات ہے۔“

”ارسلان ذرا سنبھل کر چلنا۔“ مسز ملک نے اس سے مزید پوچھ کچھ مناسب نہ جانی۔ اگلے روز وہ شہر کے دوسرے بڑے اور بدنام ہیروئن فروش شو کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ دونوں بیک اس کی مرضی کے مطابق تیار ہو گئے تھے اور وہ بڑی سرعت سے دوسرے انتظامات مکمل کر رہا تھا۔ ابھی تک شوئی تقدیر سے اس کا ہر پتہ سیدھا پڑ رہا تھا۔

○

اس اطلاع پر کہ وہ مختاراں اور نازنین کو اپنے ساتھ لندن لے جا رہا ہے، دونوں ماں بیٹی خوشی سے پھولے نہیں سارہی تھیں۔ مختاراں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ نازنین سے شادی کے لئے مختاراں کی خوشنودی حاصل کر رہا ہے اور اس چکر میں اسے لندن کی سیر کی رشوت پیش کر رہا ہے۔

”وہاں اپنا گھر ہے، دفتر بھی ہے.....!“ اس نے مختاراں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

مختاراں یہ سمجھ رہی تھی کہ واقعی اس کا ہونہار ہونے والا داماد کوئی بڑا سیٹھ ہے جس کا کاروبار دنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ ساری حرام کی کمائی ہے لیکن جو کچھ وہ ان ماں بیٹی کے ساتھ..... کرنے جا رہا تھا، یہ تو ان دونوں کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

دونوں کو تیار شدہ بیک تھما دیئے گئے۔ ایک اٹیچی کیس الگ سے تیار تھا۔ ان دونوں کو لندن سے سپانسر شپ منگوا کر بھیجا جا رہا تھا۔ دونوں بظاہر اپنے عزیز کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے جا رہی تھیں۔ ارسلان نے انہیں سمجھایا تھا کہ یہاں ہیرا پھیری سے ہی جانا پڑتا ہے ورنہ یہ لوگ ویزہ ہی نہیں دیتے۔

تینوں ایک ہی جہاز میں روانہ ہوئے تھے۔ عین آخری لمحات میں جب اس نے مسز ملک کو اپنی تازہ صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ عیش عیش کر اٹھی۔ ارسلان تو اس کی توقع سے بڑھ کر

سازش اور ٹکراؤ

ہیتھرو ایئر پورٹ پر نازنین اور اس کی ماں کی راہنمائی ان کے ہم سفر میزبانوں نے ان کی توقع سے بڑھ کر کی تھی۔ یہ مقامی لوگ تھے جو اپنے رشتے داروں کو ملنے پاکستان گئے تھے اور اب واپس آئے تھے۔ امیگریشن سے کسٹم تک وہ ماں بیٹی سے چپکے رہے۔ انہوں نے کسی مرحلے پر انہیں ارسلان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ان لوگوں نے دونوں کا سامان خود ریوالونگ بیلٹ سے اٹھا کر ٹرالی پر رکھا اور اپنے ساتھ ہی باہر بھی لے آئے تھے۔

گرین چینل سے گزرتے ہوئے اس گروپ کے صرف ایک آدمی کو روک کر کسٹم والوں نے اس کا برٹش پاسپورٹ دیکھا پھر باقیوں سے باز پرس نہیں کی.....! یہ ان کی خوش قسمتی کی انتہا تھی کہ دونوں ماں بیٹی محفوظ رہیں۔ ان کے ہم سفر تو ابھی تک ان سے چپے ہوئے تھے اور اسی نوجوان نے جس نے اپنا نام اظہار بتایا تھا نازنین کو دو تین مرتبہ الگ الگ کاغذ کے ٹکڑوں پر اپنا فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔

لیکن.....!

ان سب کی بد قسمتی کہ نازنین کے میزبان یہاں پہلے ہی سے ماں بیٹی کے منتظر

تھے.....!

”خدا حافظ۔“ نازنین نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔
دونوں ماں بیٹی جہاز کی طرف جا رہی تھیں اور ارسلان امیگریشن کی طرف۔ انہیں اس بات کی سمجھ ہی نہ آ سکی کہ اس کی بگنگ ہی ایئر سٹڈم تک تھی یہاں سے اس نے دوسرا ذریعہ سفر اختیار کرنا تھا۔



ضرورت کے لئے رکنا پڑا..... اس نے ماں بیٹی کو یہی تاثر دیا تھا کہ جیسے ارسلان کوئی بہت معزز اور کاروباری آدمی ہے۔ بنگلے پر ایک انگریز لڑکی ان کی منتظر تھی جس نے نوٹی پھوٹی اردو میں انہیں خوش آمدید کہا اور آصفہ بھی وہیں رک گئی۔

○

ان کا سامان اندر رکھ دیا گیا۔ کھانا شاید پہلے ہی سے تیار تھا۔ ابھی وہ کھانے کی تیاری ہی کر رہی تھیں جب انہیں ارسلان کا فون موصول ہوا۔ آصفہ نے فون اٹھایا تھا، پھر مختار اس کی طرف بڑھا دیا۔

”بی بی! گھبرانا نہیں۔ اس ملک کا ماحول ہی ایسا ہے۔ میں صبح تک پہنچ جاؤں گا۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی.....؟“ اس نے مختار اس کی دل جوئی شروع کر دی۔

مختار اس کو اب تک اس کے میزبانوں نے اتنا خوش کر دیا تھا کہ اب اس کے لئے گھبرانے کی کوئی بات ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے دو چار باتیں کر کے فون اپنی بیٹی کو تھما دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

نازمین نے فون پر بھی ناز و ادا دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے بڑے رومانٹک لہجے میں باؤ ارسلان کی غیر موجودگی کا شکوہ کیا۔ ارسلان نے اسے مختار اس سے زیادہ مطمئن کیا تھا اور کہا تھا یہ دونوں لڑکیاں ان کی نوکرانیاں ہیں اور وہ جس طرح بھی چاہیں گے یہ ان کی خدمت کریں گی۔ اس نے نازمین سے کہا تھا کہ جس چیز کو اس کا دل چاہے بلا جھجک انہیں بتا دے۔ پھر اگلے روز پہنچنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

دونوں ماں بیٹی کی آنکھ بھٹک چکی تھیں۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے فرشتوں کو بھی اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ ان کے دونوں بیگوں سے سارا سامان یہاں پہلے سے موجود دو بیگوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس تبدیلی کا اندازہ وہ کبھی کیسے کتنی تھیں۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں رہی ہوگی۔

دونوں نے کپڑے تبدیل کئے اور ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئیں۔

لندن وہ پہنچے تو یہاں صبح ہو رہی تھی اور گھر پہنچنے تک دو پہر ڈھل گئی تھی..... یہاں کا موسم ابھی تک ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ سہ پہر کے بعد آصفہ نے انہیں لندن دکھانے کے لئے

ایک نوجوان لڑکی نے نازمین اور اس کی والدہ کے نام کے الفاظ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ان کی سہولت کے لئے لکھے ہوئے تھے۔ اگر صرف انگریزی میں بھی لکھے جاتے تو نازمین کم از کم اپنا نام ضرور پڑھ لیتی۔

جس بے اعتنائی سے وہ اپنے ہم سفر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر ٹرائی کھینچتی ہوئی اس لڑکی کی طرف بڑھی اس ”حسن سلوک“ نے اس کے ہم سفر کو ایک مرتبہ تو بوکھلا کر رکھ دیا۔

کبخت نے کسی سے سلام لینا تک گوارا نہیں کیا۔ البتہ مختاراں نے بیٹا جی بھائی جی کہہ کر دو تین کو خدا حافظ اور شکریہ کے الفاظ کہتے ہوئے اپنی دانست میں حاتم کی قبر پر لات ضرور مار دی تھی۔

○

نازمین کے ہم سفر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ دونوں ماں بیٹی اپنی ٹرائی سمیت میزبان لڑکی کے سامنے پہنچ گئے جس نے انہیں پہنچانے ہی ”آصفہ“ کہہ کر اپنا ہاتھ باری باری دونوں سے ملایا۔ بڑی گرمجوشی سے ان کی خیریت دریافت کرنے لگی۔

ٹرائی اس نے خود تھام لی تھی اور ماں بیٹی ان کے تعاقب میں لفٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ ہتھرو ایئر پورٹ کی رونقوں نے انہیں گنگ کر دیا تھا۔ لاؤنج ہی میں موجود ”سروس“ سے اس نے دونوں کو جوس پلایا اور وہیں سے فون کر کے کسی کو اپنی آمد سے مطلع کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لفٹ کے ذریعے اوپر کی منزل میں موجود پارکنگ پر کار میں بیٹھ رہے تھے۔ سامان آصفہ نے خود ڈیوٹی میں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ تو سردی نے دونوں کے دانت بجا دیئے، لیکن کار کے ہیٹروں نے دوبارہ انہیں نارمل کر دیا۔

شیشے کے کمروں میں بند بندروں کی طرح دونوں ماں بیٹی حیرت اور استعجاب کے عالم میں راستوں کی رونقوں سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

کار انہیں ”سیشن“ کی ”ہائیڈرولین“ پر واقع ایک شاندار بنگلے تک لے آئی تھی۔ راستے میں آصفہ نے دو تین مرتبہ ان سے معذرت کی تھی کہ ارسلان صاحب کو ایمرٹرم پر ایک ہنگامی

اپنے ساتھ کار میں بٹھالیا۔ دونوں ماں بیٹی کو وہ ایک بڑے ستور پر لے آئی تھی۔ ایسا ستور وہ خواب یا فلموں میں تو دیکھا کرتی تھیں، آج عملی طور پر پہلی مرتبہ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں کے لئے یہاں سے آصفہ نے ان کے سائز کے لمبے کوٹ خریدے اور جب وہ گرم ادنی کوٹ پہن کر باہر نکلیں تو خواہ مخواہ خود کو معزز خیال کرنے لگی تھیں۔

رات گئے تک آصفہ نے انہیں لندن کی وہ وہ رونقیں دکھا دی تھیں کہ مختاراں اور نازنین دم بخود رہ گئیں۔ ایسے ایسے بازار، پارک، ہوٹل، سڑکیں، راستے، لوگ، برقی میٹر، حیرت رفاں لفظیں، انڈر گر اوڈن ریل ان کے لئے تو یہ کوئی اور ہی دنیا تھی۔ جیسے جیسے وہ لندن کا نظارہ کر رہی تھیں، ان کے دلوں میں ارسلان کی عزت اور رعب بڑھتا جا رہا تھا۔

دونوں جانتی تھیں کہ یہاں کا ایک پاؤنڈ کتنے پاکستانی روپوں کے برابر ہے اور دونوں نے دیکھ لیا تھا کہ آصفہ نے کس طرح بے رحمی سے پاؤنڈوں کو ان پر خرچ کیا تھا۔

”جانے باؤ ارسلان نے یہاں کیا دھندہ شروع کر رکھا ہے؟“ نازنین نے رات کا کھانا ایک شاندار ہوٹل میں کھاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں اپنی ماں سے کہا۔

”بچی آم کھا۔ تجھے گھٹلیوں سے کیا لینا۔ شکر کر مولا نے سن لی، ورنہ تو میرا بڑھا پارل جاتا۔“

رات کو دونوں ماں بیٹی دیر گئے تک ٹی وی سے چٹنی رہیں۔ وہ ندیدے بچوں کی طرح یہاں کے ایک ایک منظر کو، ایک ایک لمحے کو انجوائے کر رہی تھیں۔ آدھی رات کے بعد بمشکل مختاراں نے نازنین کو سونے کے لئے راضی کیا.....!

○

ایمسٹرڈم ایئر پورٹ سے باہر آ کر اس نے ڈرائیور کو ایک ایڈریس سمجھایا اور اب ٹیکسی اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ ایمسٹرڈم کے براڈوے پر تیرہویں سٹریٹ پر واقعہ ایک پلازہ پر پہنچ کر ٹیکسی رک گئی۔ بڑے بڑے خوبصورت شیشوں سے مرصع اس بلڈنگ کی پانچویں منزل کے ایک کمرے کے سامنے وہ لفٹ کے ذریعے پہنچا اور باہر لگی گھنٹی بجانے پر انڈر دروازے کے سوراخ سے ایک آنکھ نے اس کا جائزہ لیا۔

”کون ہو تم؟“ دروازے سے باہر مائیک کی آواز آئی۔

”ارسلان!“ اس نے اپنا نام بتایا۔

”کس سے ملو گے؟“ اگلا سوال ہوا۔

”سلیم صاحب سے.....!“

”او کے!“

دروازہ کھل گیا۔

جس نسوانی آواز نے اس سے انگریزی میں بات کی تھی، اسی نے دروازہ کھولا تھا۔ یہ ایک آرام دہ اور جدید ترین سہولیات سے مزین فلیٹ تھا۔ ایک کمرے میں اپنا مختصر سا سامان پھینک کر وہ لڑکی کو نظر انداز کرتا بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

لڑکی نے بھی ایک نگاہ غلط اس پر ڈالی اور اب وہ فون پر سلیم صاحب کو اس مہمان کی آمد سے مطلع کر رہی تھی۔

”تھوڑی دیر بعد وہ خود رابطہ کریں گے سر!“ اس نے کسی مقامی زبان میں فون پر بات کرنے کے بعد انگریزی میں ارسلان کو مطلع کیا۔

ارسلان کو امید تھی کہ وہ شام کی فلائٹ سے لندن جائے گا، لیکن سلیم صاحب شاید کسی ”لمبی مار“ پر نکلے ہوئے تھے۔

شام ڈھلنے تک میزبان لڑکی نے ”حق میزبانی“ خوب خوب ادا کر دیا تھا اور ارسلان کی تھکاوٹ بھی اب اتر چکی تھی۔ اسی درمیان اسے فون پر لندن رابطہ قائم کرنے پر یہ خوشخبری بھی مل چکی تھی کہ اس کے ”دونوں پارسل“ بخیر و عافیت اپنے ”ایڈریس“ تک پہنچ چکے تھے۔

اس اطلاع نے اس کے تنے ہوئے اعصاب کو خاصا پرسکون کر دیا تھا..... رہی سہی کسر ہالینڈ کی شراب اور لڑکی نے پوری کر دی۔

رات اپنے پرائیمسٹرڈم پر پھیلا چکی تھی جب سلیم صاحب بنفس نفیس وہاں آ پہنچے۔ ایک لمبا تڑنگا سیاہ قام باڈی گاڑ ان کے ساتھ ہی وہاں آیا تھا۔ پھر وہ دروازے پر جم کر بیٹھ رہا اور سجادول خان دوسرے کمرے میں ارسلان سے جو گفتگو ہو گیا..... لڑکی نے کچن میں اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔

ارسلان نے اسے بڑی تفصیل سے آگاہ کیا تھا اور بتا دیا تھا کہ نجمہ بیگم کے حکم پر اس

انوکھی بات تو نہیں۔“ اس پر پھر فلسفہ بگھارنے کا دورہ پڑا تھا۔
ارسلان کو اس نے نجمہ بیگم کے مال کی فروخت کے لئے دوبارہ بھیٹی سے رابطہ کرنے کو
کہا اور رخصت ہو گیا۔

○

اپنے کمرے ہی سے اس نے علی الصبح لندن جانے والی ایک فلائٹ پر سیٹ بک کروالی
تھی اور اس کی ڈچ میزبان نے اسے وقت گزارنے کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ لفٹھانسا
ایئر لائن کی فرسٹ کلاس میں وہ ایئر ہوسٹس کے نرے میں راجہ اندر بنا پتھر کی طرف محو پرواز
تھا۔

ایک تسکین، ایک طمانیت اور فتح کا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس
نے نجمہ بیگم پر آنکھوں کی طرح ایک ایک ہاتھ پاؤں باری باری نکال کر اپنا ٹکڑے مضبوط کرنا
شروع کر دیا تھا۔ وہ منزل ملک کو اس طرح اپنے ٹکڑے میں جکڑ لینا چاہتا تھا کہ پھر وہ ہاتھ ہلانے
کے قابل ہی نہ رہ جائے۔

”گٹ وگ“ ایئر پورٹ کے امیگریشن والوں نے ایک اچھٹی نظر اس کے پاسپورٹ
پر ڈالی جو مختلف یورپی ممالک کی مہروں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک آدھ روایتی سا سوال اس سے کیا اور
اس کے لئے لندن کے دروازے کھول دیئے۔

”ہیٹن“ کی ”ہائیڈ لین“ والے بنگلے پر جب وہ ٹیکسی سے اتر کر دستک دے رہا تھا تو
نازنین اور مختار اس ٹی دی سے چینی بیٹھی تھیں۔ دروازہ آصف نے کھولا۔

”ویل کم سرا!“ اس نے ارسلان کی شکل پر نظر پڑتے ہی دانت نکال دیئے۔
”کیسے ہیں مہمان؟“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے مہمانوں کی خیریت
دریافت کی۔

”ایک دم ٹھیک ہے سر۔“

”کام ٹھیک ہو گیا۔؟“ اس نے آصف کی آنکھوں میں جھانک کر اگلا سوال کیا۔
”یس سرا!“ آصف نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ”توقع سے زیادہ بیوقوف عورتیں
ہیں۔“

نے ”شو“ سے پاؤڈر حاصل کیا ہے۔ اسی نے بیگ تیار کر کے دیئے ہیں اور اپنی مدد کے لئے
اس مرتبہ دو طوائفوں کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ اس نے سجاد خان کو بتایا تھا کہ ابھی تک اس
نے دونوں کو لا علم رکھا ہے اور وہ یورپ دیکھنے کے شوق میں ہی قابو آگئی ہیں۔

”مستقبل میں یہ جوڑی آپ کا بہترین اثاثہ ثابت ہوگی۔ جناب اگر حکم دیں تو انہیں
قابو میں کر لوں۔۔۔۔۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ نجمہ بیگم ان
دونوں کو جانتی ہے کیونکہ یہ ملک صاحب کی خدمت بھی کرتی رہتی ہیں، لیکن آج تک نجمہ بیگم سے
ان کی براہ راست ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی ان کا آپس میں تعارف ہے۔۔۔۔۔ ہاں میں نے اسے
یہ ضرور بتا دیا ہے کہ میں اس مرتبہ انہیں استعمال نہیں کروں گا۔“

چرب زبانی اور مکاری پر جو کمال اسے حاصل ہو گیا تھا اس کے لئے وہ اکثر خود کو دل
ہی دل میں داد دیا کرتا تھا۔

”وینڈر فل۔۔۔۔۔!“ خدا جانے سجاد خان نے اس کی مکاری کو خراج تحسین پیش کیا تھا یا
ارسلان کو؟“ اس نے اپنی عادت کے مطابق ٹہلے ہوئے اس کی بات پر غور کیا تھا، پھر سگریٹ کا
کش لگا کر اسے داد دی۔

ارسلان کا دل بلیوں اچھلا۔۔۔۔۔ جس کامیابی سے وہ اپنا کھیل کھیل رہا تھا، یہ اسی کا حصہ
تھا۔

”میں دیکھوں گا اسے۔۔۔۔۔ کہاں تک بھاگے گی سالی۔“ سجاد خان آہستہ سے
بڑبڑایا۔

”بہت احسان فراموش عورت ہے خان صاحب۔ میں نے سیاست میں بہت برے
برے لوگوں کو دیکھا ہے لیکن ایسی ناگن نہیں دیکھی۔“ اس نے سجاد خان کے موڈ کو سمجھتے ہوئے
بات آگے بڑھائی۔

”تم مجھے باخبر رکھنا بر خوردار! ابھی تک اس کا واسطہ اپنے جیسے لوگوں سے رہا ہے۔ میں
اسے جہنم رسید کر دوں گا۔۔۔۔۔ مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ جاتی کہاں تک ہے۔۔۔۔۔ اور ہاں اب تم
کسی بھی طرح اسے اپنے ساتھ لندن آنے پر تیار کرنا۔ باقی پلان تجھے میں سمجھا دوں گا۔ ان
عورتوں کو قابو میں رکھو۔ کبھی کبھی کھوٹا سکہ بھی چل جاتا ہے۔۔۔۔۔ دنیا کے بازار کا اتار چڑھاؤ کوئی

ہوں بازار میں تمہارا ایسا رعب ہو کہ پھر کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔“
”اے بیٹا! تمہارے منہ میں گھی شکر.....!“ مختاراں نے ہاتھ کے مخصوص اشارے سے کہا اور کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ شاپنگ کے لئے جا رہے تھے۔.....!
کارا اس مرتبہ بھی آصفہ چلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر مختاراں بیٹھی تھی اور اس کی صاحبزادی بچھلی سیٹ پر ارسلان کے ساتھ چکی بیٹھی تھی۔

لندن کو دن میں دیکھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا..... پہلے ہی اسٹور میں گھومتے ہوئے انہیں دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ماں بیٹی نے ندیدے بچوں کی طرح لپک لپک کر میک اپ کا سامان اٹھایا تھا اور اپنے لئے الگ الگ انتخاب کیا تھا۔ دونوں سامان کے پیکیٹوں سے لدی پھندی باہر آئیں۔ اب کارا رخ ایک مہنگے ہوٹل کی طرف تھا۔

بذائقہ کھانے دونوں ماں بیٹی اس طرح مزے لے کر کھا رہی تھیں جیسے وہ بچپن سے ہی کھاتی آرہی ہوں۔ ان کی حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ آصفہ انہیں ”جنگلی“ نہ سمجھے اور خود کو مہذب ثابت کرنے کے لئے وہ لقمہ لقمہ کر کے انگریزی کھانے زہر مار کر رہی تھیں۔
شام تک تھک کر وہ چور ہو گئیں تو آصفہ انہیں واپس لے آئی۔

○

اس رات بھٹی ان سے ملنے آیا تھا۔ اس نے دونوں بیک وصول کر لئے تھے۔ نجمہ بیگم والے بیک کا 70 لاکھ روپیہ ارسلان نے الگ سے وصول کر لیا تھا اور دوسرے بیک کی مزدوری بھی لاکھوں روپے کی صورت میں اسے ملی تھی۔

ہوس کی ماری مچھلیوں کو اپنے جال میں مزید گہرا پھنسانے کے لئے اس نے اچھی خاصی پاکستانی کرنسی بھی اپنے پاس رکھ لی تھی اور اب وہ مختاراں بیگم پر اپنا آخری اور بھرپور داؤ کھیلنے جا رہا تھا۔

بھٹی سے اس کو جو لاکھوں روپے وصول ہوئے تھے ان میں سے ایک آدھ لاکھ ان پر خرچ کرنا اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی لیکن مختاراں کی تو آنکھیں اس دولت کی چمک سے خیرہ ہو سکتی تھیں۔

○

باؤ ارسلان کو اچانک وہاں دیکھ کر ماں بیٹی کی باچھیں کھل گئیں۔
مختاراں تو صدمہ وار ہونے لگی جب کہ نازنین اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی.....
گھاگ نائیکہ اچانک ہی کسی کام کا بہانہ کر کے باہر نکلی اور اس کے جاتے ہی نازنین ارسلان کے گلے کا ہار بن گئی۔

اس نے ایک ہی لمحے میں اپنے سارے خاندانی داؤ پیچ آزمائے تھے۔ اب تو ماں بیٹی اس سونے کی کان کو کسی بھی صورت ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھیں۔ انہیں تو باؤ ارسلان کی اہمیت کا علم ہی اب ہوا تھا۔

مختاراں نے جب سمجھ لیا کہ اب بچی نے دل کی بھڑاس نکال لی ہوگی تو وہ کمرے میں چلی آئی۔

”بیٹا! ایک لمحے کے لئے بھی مولا کی قسم لے لو اگر بچی نے آنکھ جھپک کر دیکھا ہو.....
یہ تو میرا مولا ہی جانتا ہے۔ میں اسے اس موئے ہوائی اڈے سے جہاں تم اتر گئے تھے کیسے لندن تک لائی ہوں۔ بس ایک مرنے کی کسر باقی تھی.....“ اس نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق گاہک پر طبع آزمائی شروع کر دی۔

”بی بی! میں نے کہا تھا نا کہ صبر کرو عیش کرا دوں گا۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا..... خیر! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے.....؟“ اس نے مختاراں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”باؤ ارسلان پر یہ اتنا بزنس اتنی دولت! تم نے پہلے تو کبھی بتایا ہی نہیں.....!“ مختاراں نے بڑی خاص نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بی بی! تمہیں آہستہ آہستہ سب سمجھ آ جائے گی۔ اگر میں تمہیں وہاں سب کچھ بتا دیتا تو تم کبھی یقین ہی نہ کرتیں کیونکہ بد قسمتی سے میرے ساتھ ایک دھوکا ہو چکا تھا، لیکن ان ہی لوگوں کی مدد سے پھر میں نے اپنا بزنس چلا لیا ہے۔ بی بی! کسی کی جرأت نہیں کہ یہاں یا وہاں اپنے ملک میں ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے..... اور ہاں ابھی تو تمہارے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری ہے میرے پاس..... لیکن زیادہ بے چینی نہ دکھانا۔ وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گا..... ابھی تم تیار ہو جاؤ۔ ذرا بازار سے شاپنگ کر لیں۔ گھبراتا نہیں۔ جو چیز دل کو اچھی لگے اٹھا لیتا..... میں چاہتا

تھا کہ اس موقع پر تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں شامل کروں۔ یہ لاکھوں کروڑوں کا کھیل ہے.....
بی بی تم جانتی ہو کہ پیسے میں کتنی طاقت ہے۔ دونوں طرف مل ملا کر کام چل جاتا ہے۔ کچھ حصہ یہ
لوگ لے لیتے ہیں کچھ ادھر والے اور بس..... باقی خطرہ یوں بھی زندگی میں ہر وقت رہتا
ہے.....!“ اس نے اپنے آپ سے مختاراں کو تسلی کروادی۔

آخری دو چار فقرے اس نے جان بوجھ کر کہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ہوس کے مارے
ذہنوں کو ایسی بودی دلیلیں بہت مطمئن کیا کرتی ہیں اور واقعی مختاراں کی رال منکے لگی تھی۔

”بی بی! تمہیں کیا علم نہیں کہ ہمارے شہر کی بڑی بڑی بیگمات کیا کرتی ہیں..... میں
تمہیں دس پندرہ نام ابھی گنوا دیتا ہوں۔ بس دو تین مہینے میں ایک چکر لگا لیا اور ساری زندگی کی
روٹیاں اکٹھی کر لیں..... میں تو کہتا ہوں بی بی! ایک آدھ چکر تم بھی لگا لو..... سارا بازار خرید لو
گی۔“ ارسلان کی آخری بات نے مختاراں کے دماغ میں زور ار جھلکا کیا۔

لاچ کی ماری طوائف کو اس نے پانچ منٹ بعد ہی ششے میں اتار لیا۔ جب اس نے
مختاراں کو بتایا کہ وہاں سے روٹگی پر اسے ایک چکر لگانے کے لئے دو لاکھ روپے ایڈوانس مل جائیں
گے تو مختاراں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

”ارے بیٹا! جب ساری دنیا یہ کام کر رہی ہے تو ہمارا بھی بھلا ہو جانے دو..... کوئی ہمارا
کام بھی کروا دو..... ساری زندگی تمہارے پیرو دھو دھو کر پیش گے.....!“ مختاراں کے منہ میں
لاکھوں کے ذکر سے پانی بھر آیا۔

”بے فکر رہو بی بی! اگلی مرتبہ تم آؤ گی تو ایسے بریف کیس نوٹوں سے بھر کے لے جاؤ
گی۔“

”دیکھ لو بی بی! میں تو ہر صورت تمہارا فائدہ چاہتا ہوں۔ پھر بھی سوچ سمجھ لو۔ اگر ماضی
کی کوئی بات تمہارے ذہن میں ہے تو اسے نکال دو۔“

”ارے جانے دو بیٹا! کیا باتیں لے بیٹھے..... بیٹا! میں کوئی لالچی عورت نہیں ہوں۔
بس ایک ذرا زندگی گزارنے کا آسرا ہو جائے تو کس کافر کا دل چاہے گا ایسے کام کرتا پھرے.....
بیٹا! پھر تم ہی تو کہہ رہے ہو کہ ساری دنیا یہی کچھ کر رہی ہے۔“ مختاراں نے اپنے مخصوص خاندانی
انداز میں کہا۔

کمرے میں اس وقت وہ تینوں ہی موجود تھے جب اچانک ہی ارسلان اپنی جگہ سے
اٹھ اور دوسرے کمرے میں جا کر بریف کیس لے آیا۔ بریف کیس اس نے مختاراں کے سامنے
کھولا تو دم بخود رہ گئی۔ یہاں پاکستانی اور برطانوی نوٹ بڑے سلیقے سے ترتیب سے سجے تھے۔
ارسلان نے 50 ہزار گن کر مختاراں کی طرف بڑھادیئے اور بریف کیس بند کر لیا۔

”میری طرف سے یہ معمولی سا نذرانہ نازنین کے لئے ہے۔ بی بی! اس مرتبہ مجھے
بہت زیادہ منافع ہوا ہے۔“

ہونقوں کی طرح منہ پھلائے مختاراں نے جانے کس میکا کی عمل کے تحت اپنا ہاتھ
بڑھایا اور نوٹ ہاتھوں میں تھام کر ان کو محسوس کیا۔ پھر اس احساس کے بعد کہ خواب تو نہیں دیکھ
رہی اس نے نوٹ نازنین کی طرف بڑھاتے ہوئے ہر ممکن طریق پر شکریہ ادا کرتے جانے کتنی
دعا کیں دیتے ہوئے اس کا سر اور منہ اپنے پوٹے منہ سے چوم لیا۔

نازنین کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑے..... اس نے
نظروں ہی نظروں میں نجانے کتنی مرتبہ اس کا شکریہ ادا کیا۔

مختاراں بڑی جہاندیدہ طوائف تھی۔
ایک زمانہ اس نے دیکھ رکھا تھا۔

وہ اتنی بھولی بھی نہیں کہ باؤ ارسلان کے کاروبار کو سمجھ نہ پاتی، لیکن اس کے منہ سے سننا
ضرور چاہتی تھی۔

”بیٹا! اب ہم میں کوئی پردہ تو رہا نہیں۔ اگر اپنے کاروبار میں ہمیں بھی شامل کر لو
تو.....“

”بی بی!“ ارسلان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اب تم اتنی سیدھی بھی نہیں کہ میری
بات کا مطلب نہ سمجھ سکو۔ میں نے بھی زندگی میں بہت دھکے کھائے ہیں۔ ہر محفل میں بیٹھا ہوں۔
میں نے دیکھا ہے کہ سب لوگ یہی کر رہے ہیں۔ آخر میں ساری زندگی کسی کا ”تھک ٹوکا“ بن کر تو
نہیں رہ سکتا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں بھی دولت کماؤں گا۔ اب تک میں نے صرف دو چکر
لگائے ہیں اور دیکھ لو۔ لاکھوں کروڑوں میں کھیل رہا ہوں..... بی بی! میں تمہیں صاف بتا دوں کہ
اس مرتبہ بھی میں مال لے کر آیا تھا جو میں نے جہاں میں اترا تھا وہیں دینا تھا..... میں نہیں چاہتا

وہ نہیں جانتی تھیں کہ دو دن لندن میں ان کے بعد ارسلان نے یونہی نہیں گزارے تھے..... اپنے سب سے پہلے میزبان مائیکل سے جواب سجادول خان کے گروہ سے علیحدہ ہو کر اپنا کام کر رہا تھا، مل چکا تھا۔

مائیکل سے اس کی ملاقات بھٹی کی قیام گاہ کے نزدیک ایک مارکیٹ میں ہو گئی تھی۔ جہاں اس نے خود ہی ارسلان کو پہچان کر اس کا نام لے کر آواز دی تھی۔

پہلے تو ارسلان کے اوسان خطا ہو گئے کہ یہ کیا مصیبت آگئی کیونکہ اس مرتبہ وہ کسی دوسرے نام کے پاسپورٹ سے سفر کر رہا تھا۔

لیکن اسے اس بات کا احساس مائیکل نے خود ہی دلادیا کہ وہ خود اس کی تلاش میں تھا۔ مائیکل سے یہ بات بھی اس کے علم میں آئی کہ اس نے سلیم خان والے گروہ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور اب وہ ایک دوسرے ایشیائی مافیا سے منسلک ہے۔ اس نے ارسلان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جہی اگر چاہے تو امریکہ پارٹیوں کے ساتھ اس کا رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔“

ارسلان نے فوراً ہامی بھری۔

یہ شخص اس کے مستقبل کے منصوبے میں ضرور فٹ بیٹھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے اس ملک کو خیر باد کہنا پڑے گا۔

اب اس نے باہر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔

فرار کا راستہ.....!

اسے ایک دن بالآخر بھاگ جانا تھا..... یوں بھی اس نے جس بھیانک کھیل کا آغاز کیا تھا، وہ کسی بھی لمحے اپنے انجام کو پہنچ سکتا تھا۔

کسی بھی پل حالات کا پہیہ الٹا چلنا شروع ہو جاتا اور اسے بڑی بے رحمی سے کچل دیتا۔ وہ جانتا تھا۔ اس نے ایک بے گناہ کو قتل بھی کیا ہے۔ کہیں نہ کہیں اس کے اندر والدین کی دی ہوئی مذہبی تعلیمات زندہ تھیں۔

گناہ کی دلدل میں بہت گہرا اترنے کے بعد بھی وہ مکافات عمل سے لرزاں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بالآخر ستم ظریفی حالات اسے انصاف کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دے گی جہاں سوائے مظلومت کے اور کوئی دلیل اس کے حق میں نہیں جاتی تھی۔

”تم تو یوں تصدیق کر رہی ہو بی بی جیسے تمہیں اس بات کا علم نہیں۔“ ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایک ہفتہ تک لندن کی رونقوں میں غرق رہنے کے بعد جب ماں بیٹی ہوس کی دلدل میں گردن گردن تک دھنس گئیں تو ارسلان نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ دونوں کا دل ابھی نہیں بھرا تھا۔

لیکن.....!

ارسلان بھی نہیں چاہتا تھا کہ دونوں کا دل بھر جائے۔

اس مرتبہ اس نے دونوں کو دو دن پہلے روانہ کیا تھا اور خود ایک دوسری فلائٹ میں اپنے ملک پہنچا تھا۔ اس نے مختاراں سے کہہ دیا تھا کہ ادھر کسٹم پر کوئی ان کے بکس نہیں کھولے گا۔

اور ایسا ہی ہوا.....!

ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر ہی ان کا میزبان موجود تھا جو انہیں امیگریشن اور کسٹم سے گزار کر سیدھا ٹیکسی سٹینڈ پر لے گیا۔

دونوں ماں بیٹی مسرت سے سرشار ارسلان کی کوٹھی کی طرف ایک ٹیکسی میں اڑی چلی جا رہی تھیں۔

دوروز بعد ارسلان بھی ان سے آن ملا۔

○

دونوں ماں بیٹی غیر ملکی سامان سے لدی پھندی اپنے ملک پہنچی تھیں۔ مختاراں نے دوسرے ہی روز بازار کا چکر لگایا اور ہر ممکن طریقے سے اپنے غیر ملکی دورے کی خبر اپنے حامدوں کے کانوں تک پہنچائی تھی۔

”جل کر رہ گئیں غوڑیاں۔“ اس نے ارسلان کا سر ماتھا چومتے ہوئے بتایا.....!

”تم دیکھتی رہو بی بی! ابھی کیا کچھ ہونے والا ہے.....!“ ارسلان نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ ”تمہارے مخالفوں کی زبانیں دانتوں میں نہ بادوں تو میرا نام بدل دینا۔“

اور.....!

مختاراں نے دل و جان سے اس کی بات مان لی۔

یہاں جھوٹ ہی سب سے بڑا سچ تھا اور یہاں سچ ہی سب سے بڑا جھوٹ بھی تھا۔
 ارسلان تو اس مکروہ ریا کاری کے سمندر میں ایک نیکے جھپکی اہمیت بھی نہیں رکھتا تھا۔
 یہاں تو کبر و نخوت کے ایسے ایسے پہاڑ کھڑے تھے کہ جن سے سچائی، ایمانداری اور اصول پرستی
 جانے کتنے طویل عرصے سے اپنا سرخ رہی تھی۔
 منافقت کے کیا کیا رنگ دروہ نہیں تھے کہ جو ارسلان نے نہ دیکھ لئے ہوں۔

○

مزر ملک کے سامنے جب اس نے نوٹوں سے بھر ابریف کیس کھولا تو زندگی میں پہلی
 مرتبہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر وہ دیوانہ وار اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ ایسی گری پڑی
 عورت تھی وہ.....!

ارسلان کو گھن آنے لگی تھی اس سے.....!

اس نے بھی مزر ملک سے بڑھ کر جوش و خروش کا اظہار کیا تھا اور اسے باور کروانے کی
 کوشش کی تھی کہ دراصل اس نے ارسلان کو ”انڈر اسٹی میٹ“ کیا ہے۔
 ”میں نے زندگی میں شاید پہلی مرتبہ مرد کو سمجھنے کی غلطی تب کی تھی جب تمہارے متعلق
 غلط اندازہ لگایا۔ تم تو بہت زبردست آدمی ہو..... بہت کام کے..... تم نے تو میرے سارے
 اندازے غلط ثابت کر دیئے ارسلان۔“

اس نے برف کیس بند کرتے ہوئے سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور دھوئیں کے مرغولے
 بناتے ہوئے دوبارہ ارسلان سے مخاطب ہوئی..... ”مجھے افسوس ہے کہ سجاد خان نے اپنے
 اصول کے مطابق تمہاری تصاویر بھی بنائیں اور بد قسمتی سے نیکو بھی حسب روایت اپنے قبضے میں
 رکھے..... لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں بہر صورت اس کی رائے تمہارے متعلق بدل ڈالوں گی.....
 دراصل ارسلان سجاد خان حد سے زیادہ محتاط اور بظاہر لا پرواہ انسان ہے۔ اس کے اب تک بچے
 رہنے کا راز بھی یہی ہے کہ اس نے اپنے کچھ اصول بنائے ہیں جن پر وہ بڑی سختی سے عمل پیرا
 ہے۔ بغیر کسی رعایت کے وہ ان اصولوں کا اطلاق خود پر بھی کرتا ہے..... گو کہ میں نے تمہیں بتایا تھا
 کہ تمہاری تصاویر میں نے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے بنائی تھیں، لیکن دراصل یہ سب کچھ سجاد خان
 کی پلاننگ کا حصہ تھا۔ وہ اپنے کسی بھی درکر کو کبھی اپنی مٹھی سے نکلنے نہیں دیتا۔

لیکن.....!

یہ مظلومیت بھی تب تک تھی جب تک وہ معصوم تھا۔
 اب تو وہ خود ظالم تھا۔ اپنے انتقام کی آگ میں اندھا ہو کر سب کچھ داؤ پر لگانے پر تزلزل
 گیا تھا۔
 مائیکل کا رابطہ اس نے محفوظ کر لیا تھا۔

اس نے امریکہ کے دو نمبر ارسلان کو دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب کبھی اس پر زندگی کے
 تمام دروازے ایک ایک کر کے بند ہو جائیں تو وہ یہاں ضرور دستک دے۔ شاید مائیکل نے ایک
 عرصہ سلیم خان مافیا کے ساتھ کام کرنے کے بعد یہ احساس کر لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ارسلان بھی
 اس کی طرح اس مافیا سے پناہ مانگے گا..... اور اس دنیا کے اصولوں کے مطابق تب ارسلان کو بھی
 سوائے کوئی اور ”مضبوط سہارا“ ڈھونڈنے کے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دے گا۔

مائیکل کے ساتھ خاصا وقت گزارنے کے بعد ہی وہ لوٹا تھا۔
 ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں..... کانتا سے ملاقات کی خواہش بیدار ہوئی تھی
 لیکن کسی مصلحت کے تحت اس نے گریز کیا۔ وہ اب دوبارہ اس گندے کھیل میں حصہ نہیں لینا چاہتا
 تھا۔

اسے احساس ہو گیا تھا کہ ملکی محبت میں بھی اس بد قسمت ملک کے شہری خود مختار نہیں۔
 یہاں ملک سے محبت کرنے کے لئے بھی ان بازی گروں سے سرٹیفکیٹ لینا ضروری ہے جو
 سیاست کی شطرنج پر بچھے مہروں کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ اپنے دیسی اور بدیسی آقاؤں کے
 اشارے پر۔

اور جو مادر وطن کو پر کاہ جتنی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ سیاست کے اس گھناؤنے بازار میں آج کا محبت وطن کل کا
 غدار۔

آج کے غدار کل کے محبت وطن بن جاتے ہیں.....!

عجب طرفہ تماشا تھا کہ ہر کوئی دوسرے کو غدار اور خود کو قومی سلامتی کا واحد ذمہ دار بنانا
 اور کہلانے پر بھند تھا۔

رہی۔

○

بھنڈر زخم خوردہ سانپ کی طرح تللار ہاتھا.....!

ملک صاحب نے پارٹی میں اس کی پوزیشن زیرِ ذکر کے رکھ دی تھی۔ جب وہ پارٹی میں موجود تھے تب بھی بھنڈر کی ایک نہیں چلتی تھی اور وہ بے بسی سے سوائے ملک صاحب کے اپنے دوستوں کی محفل میں لعن طعن کرنے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب جب کہ قسمت نے اسے موقع دے ہی دیا تھا اور ملک صاحب نے اچانک فلور کراسنگ کر لی تھی تو بھی وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر پایا تھا۔

سٹوڈنٹ سیاست کے ذریعے وہ جو کھیل کھیلے جا رہا تھا وہ بھی اب اس کی نیکی کا باعث بن گیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ سیاست میں اپنی اہمیت منوانا ہی فن ہے۔

جب تک وہ اپنی اہمیت تسلیم نہیں کرواتا، کوئی اسے تسلیم نہ کرتا۔

اس نے سٹوڈنٹ ونگ پر قبضہ جما کر بظاہر ”سٹوڈنٹس پاور“ کو اپنا ہتھیار بنانے کی پلاننگ کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ملک کو کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہوئے، وہ بھی ان طلباء کے ذریعے ہی اپنا گندا کھیل رچائے ہوئے تھا اور اس کی اہمیت بھی ان ہی کی وجہ سے تھی۔

لیکن.....!

یہاں تو الٹا آنتیں گلے کو آ رہی تھیں۔ ایک ہی جھکے نے اس کے کس بل نکال دیئے تھے۔ انقلابی طلباء فیڈریشن کے ذریعے اس نے ملک کے حامی گروپ پر جو حملہ کیا تھا، اس کا جواب ایسا بھر پور تھا کہ بھنڈر چاروں شانے چت ہو گیا۔

ایکشن کا اعلان ہونے والا تھا.....!

پارٹی ٹکٹوں کی تقسیم کے لئے وزیر اعلیٰ اپنے ساتھیوں سے الگ الگ مشاورت کر رہا تھا۔ بھنڈر کو اور کسی میدان میں تو برتری حاصل نہیں تھی، لیکن پارٹی کے سنٹرل سیکرٹریٹ پر اس نے اپنی گرفت ضرور مضبوط کر رکھی تھی۔

اراکین پارٹی کے ذریعے ہی نہیں..... بلکہ پارٹی ٹکٹوں کے ذریعے اعلیٰ عہدیداروں

ارسلان جانتا تھا کہ اس وقت مسز ملک کہاں سے بول رہی ہے۔ وہ اب اپنی دانست میں اپنی مظلومیت کا ڈرامہ رچانے جا رہی تھی۔

لیکن.....!

یہ سب بیکار تھا.....!

”مسز ملک تم نے واقعی ارسلان کو سمجھنے میں غلطی کی..... اور یہ جو تمہارا فوٹو گرائی کا شوق ہے یہ بھی میں ضرور پورا کر دوں گا۔“

اس نے دل ہی دل میں کہا۔

مسز ملک اپنے کمرے میں نوٹوں سے بھرا بریف کیس رکھ کر واپس آ گئی تھی اور ارسلان اسے ایک کہانی گھڑ کر سن رہا تھا کہ کس طرح اس نے طوائفوں کو بیوقوف بنا کر اپنا الوسیدھا کیا۔

”نجمہ صاحبہ! آپ کی شخصیت کا بہت رعب ہے ان پر..... اور میں چاہتا ہوں کہ کسی مناسب موقع پر آپ کی ان سے ایک ملاقات بھی ہو جائے۔ اس وقت انہیں یقین آ جائے گا کہ واقعی آپ کی پشت پناہی ہمیں حاصل ہے۔ ابھی تک میں نے انہیں یہی بتایا ہے کہ یہ کام تو میں اکیلے کر رہا ہوں، لیکن کبھی اگر کوئی مصیبت پڑی تو آپ میری مدد کریں گی۔ مسز ملک! میں نے انہیں اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی کہ آپ کا اس بزنس سے دور کا بھی واسطہ ہے..... اور ہاں! آج آپ کو یہ بتا دوں کہ ملک صاحب کی تصویر والے کیس میں بھی میں نے آپ کا نام نہیں آنے دیا۔ میں نے انہیں یہی بتایا تھا کہ مخالف پارٹی کے لوگ تصویریں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مسز ملک ہم جس کا نمک کھائیں، اس سے نمک حرامی کبھی نہیں کرتے۔“ اس نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

مسز ملک یوں ہونٹوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ شاید اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کیا واقعی وہ سچ بول رہا ہے..... اس کی اندرونی کشمکش کا اندازہ اس کے سانولے چہرے کی بدلتی کیفیات سے ارسلان بخوبی کر سکتا تھا..... دل ہی دل میں وہ مسز ملک کے اندر چلنے والی جنگ سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔

پھر جیسے مسز ملک کو اس کے لفظوں کی سچائی پر یقین سا آ گیا۔ اس نے ”اودہ ارسلان یو آر گرینٹ!“ کہتے ہوئے خود کو ارسلان پر ڈھیر کر دیا اور خاصی دیر تک اسے خراج تحسین پیش کرتی

کوئی ہنگامہ، کوئی دھوم دھڑکا، کوئی چھوٹی موٹی سی بد معاشی ضروری تھی۔ اس کے بغیر
بھنڈر کا رعب داب کیسے قائم ہوتا!

تو پھر.....!

کچھ ہونا چاہئے تھا..... کچھ بھی..... فوری طور پر..... ورنہ نکلنوں کا فیصلہ ہو جاتا اور بھنڈر
صاحب ناکارہ برتن کی طرح پارٹی کی آخری صفوں میں کہیں پھینک دیئے جاتے۔

”او کے!“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور ایک شیطانی منصوبہ اس کے ذہن میں جڑ
پکڑنے لگا۔

○

آج اس نے اس سلسلے میں ہنگامی میٹنگ طلب کی تھی۔

گجر گروپ کے پانچ مشنڈے سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھے تھے اور بھنڈر کا غصہ
آسمان کو چھو رہا تھا۔

”میں نے ساری زندگی تمہیں فیڈر سے دودھ پلانے کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ ذرا ہاتھ پیر
ہلاؤ..... تمہاری وجہ سے ہمیں بہت ذلالت اٹھانا پڑی..... انکیشن سر پر آ رہا ہے۔ اگر کچھ نہیں کر
سکتے تو میری جان چھوڑ دو اور اس بات کا خیال رکھنا کہ اگر میرا گروپ کمزور پڑ گیا تو ساری زندگی
جیلوں میں پڑے سڑتے رہو گے۔ پولیس ایسے ایسے گڑے مردے اکھاڑے گی کہ پھر.....“
”سرجی آپ حکم کریں۔ انشاء اللہ شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا۔“ ایک چرسی نے اونگھتے
ہوئے کہا۔

”میں خاک حکم کروں۔ تم کیا منہ میں انگوٹھا لے کر بیٹھے ہو حکم کے بچے.....“

بھنڈر نے مغفلات بکتے ہوئے کہا۔

”بس بس بھنڈر صاحب! بہت ہو گئی..... اب ہم آپ کو کچھ کر کے ہی دکھائیں گے۔
میں نے آپ کی ہدایت پر ذرا ہاتھ نرم رکھا ہے ورنہ نوید گروپ کو تو ہم سانس نہ لینے دیں۔“
گجر کو جوش آ گیا۔

”باتیں ہی کرتے رہنا۔ کچھ کر کے بھی دکھاؤ۔“ بھنڈر صاحب کے ساتھ ایم پی اے

نے کہا۔

کے سیکرٹریوں کے ذریعے وہ پارٹی کے اندر ہونے والے فیصلوں سے باخبر رہتا تھا۔

اور.....!

ان ہی لوگوں کے ذریعے یہ بات اس کے کانوں تک پہنچی تھی کہ پارٹی کی خفیہ میٹنگز
جن میں اسے مدعو نہیں کیا جا رہا تھا، ان میٹنگوں میں نکلنوں سے متعلق جو فیصلے کئے جا رہے تھے ان
میں بھنڈر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا رہی تھی۔ جس طرح وہ خود کو ”ملک صاحب ثانی“ ثابت
کرنے جا رہا تھا..... اس کی یہ حیثیت کوئی نہیں مانتا تھا۔

پھر وہ اپنی حیثیت کیسے منوائے.....؟

یہ اس کی غیرت اور مردانگی کے شایان شان نہیں تھا۔ وہ تو مستقبل میں پارٹی قیادت پر
اپنے گروپ کے ذریعے قبضہ جمانے کی فکر میں تھا اور اگر اس کی مرضی کے دس آدمیوں کو نکٹ نہیں
مل سکتا تو اس کا بنے گیا کیا؟

بھنڈر کی مردانگی نے جوش مارنا شروع کر دیا تھا اور اس نے صوبائی قیادت کو اپنے وجود
کا احساس دلانا ناگزیر سمجھنا شروع کر دیا تھا اور یہ احساس اس طرح دلایا جاسکتا تھا کہ وہ پارٹی کی
اعلیٰ قیادت کے لئے مسائل کھڑے کر دے۔

یہی سیاست تھی یہاں کی.....!

یہی چلن تھا مروجہ سیاست کا کہ اپنی اہمیت منوانے کے لئے تمام اخلاقی، اصولی اور
قانونی ضابطوں کو جنم رسید کر کے بد معاشی اور غنڈہ گردی کے ذریعے اپنا آپ منوایا جائے۔

کچھ ایسا کر کے دکھایا جائے کہ انتظامیہ کو ناکوں چنے چوادیئے جائیں اور پھر حاتم کی
قبر پر لات مار کر اپنے ہاتھوں لگائی آگ پر خود ہی پانی ڈال کر اسے بجھا بھی دیا جائے۔

مگر مجھ کے آنسو بہاتے ہوئے اس تباہی کا ماتم بھی کیا جائے تا آنکہ پارٹی حلقوں
میں اس کے نام کی دھوم بجنے لگے اور قیادت یہی سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ معزز ممبر پارٹی جب
چاہے مسائل کو پلک جھپکتے ختم کر سکتا ہے۔

یہی کچھ تو ملک صاحب کرتے تھے..... پہلے کرائز کھڑا کرتے، پھر آگے بڑھ کر اسے
ختم بھی کر دیتے۔

بھنڈر جانتا تھا سوئے ہوئے بچے کا منہ چومنے سے کوئی کسی کی اہمیت تسلیم نہیں کرتا۔

سے انکار کر دیا۔ وہ بھی کمشنر آفس میں کام کرتا تھا اور ہر محکمے سے اس کی سُر تھی۔ بیوہ نے ایک آدھ وکیل سے مشورہ کیا تو فیس سن کر ہی ڈر گئی۔ اب اس کے پاس سوائے صبر و شکر کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب اچانک نوید گروپ کے غنڈوں کی نظر میں وہ آ گئی، کیونکہ یہ لوگ کتوں کی طرح ایسے ضرورت مندوں کی بوسو گھنٹے پھرتے تھے۔ انہوں نے بیوہ سے اونے پونے داموں مارکیٹ سے قریباً نصف ریٹ پر مکان خرید لیا۔ اس بے چاری نے بھی ”ساری جاتی دیکھئے تو آدھی دیجئے چھوڑ“ کے مصداق جو کچھ ملا، صبر شکر کر کے وصول کر لیا اور زمین ان لوگوں کے نام لکھ دی۔ اب انہیں زمین خود خالی کر دانا تھی۔

وہ جانتے تھے کہ کلرک بادشاہ نے بھی عدالت میں اپیل کر رکھی ہے اور ”ٹے آرڈر“ لیا ہوا ہے لیکن ان کے لئے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے ایک عرصے سے وہ یہی کچھ کرتے آ رہے تھے۔

اگلے ہی روز وہ بندوقیں پستولیں لے کر کلرک کے ہاں جادھمکے اور اسے 24 گھنٹے کے اندر اندر مکان خالی کرنے کا نوٹس دیا بصورت دیگر حالات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوگی کی دھمکی دے کر لوٹ آئے۔

کلرک بھی جرائم پیشہ آدمی تھا۔ ساری زندگی اس نے حلال کمائی کا منہ نہیں دیکھا تھا اور اتنی کچی گولیاں بھی نہیں کھیلی تھیں کہ ایک ہی دھمکی سے مار کھا جاتا۔ جس سیٹ پر وہ کام کر رہا تھا یہ تبادلوں کی سیٹ تھی جہاں اکثر اس کی چاندی بنی رہتی تھی۔ شاید ہی اس شہر کے کسی تھانے کا انچارج ایسا ہوگا جس نے ایک آدھ مرتبہ اپنے کسی محکمانہ کام کے لئے اس سے رجوع نہ کیا ہو۔

پہلے تو اس نے چاہا کہ پولیس کے ذریعے ان کی ٹھکانی کر دائے لیکن جب پولیس والوں نے دیکھا کہ مقابلہ ”سنڈونٹس مافیا“ سے ہے تو انہوں نے معذرت کر لی۔

کلرک بادشاہ نے ہار نہیں مانی تھی.....!

دو تین مرتبہ نوید گروپ کے آدمی اس کے بیوی بچوں کو ڈرا دھمکا چکے تھے اور ایک ”پھینٹی“ بھی اسے لگا دی تھی، لیکن یہ شخص بھی نجائے کس مٹی کا بنا تھا کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اس روز اچانک ہی کلرک کو ایک خیال آیا کہ وہ سانپ کو سانپ سے کیوں نہ ٹکرا دے

”دیکھئے جناب! اب ایسی بات نہ کریں۔ میرے لڑکوں نے آپ کے حکم پر کبھی پیٹھ نہیں دکھائی.....!“ گجر نے خود پر مشکل سے قابو پایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ کل سے کام شروع کر دو اور ہاں اس مرتبہ براہ راست ملک کی خبر لو۔ کسی بات کی پروا نہ کرنا۔ بس اپنے آدمی درمیان میں نہ آئیں۔ اگر کوئی پکڑا جائے تو دے دلا کر کام چلانے کی کوشش کرنا۔ اگر بات نہ بنے تو تب مجھے بتانا..... ان وگین والوں کی وجہ سے ہمیں بہت زک اٹھانا پڑی ہے اور تم لوگ ابھی تک کچھ نہیں کر سکتے..... یہ رکھ لو۔ ضرورت ہوئی تو اور لے جانا.....!“

بھنڈر نے بریف کیس سے نوٹوں کے دو بڈل نکال کر گجر کی طرف یوں پھینکے تھے جیسے کتے کے سامنے چھچھڑے ڈالے جاتے ہیں۔ گجر نے بھی انتہائی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوٹ اٹھائے اور گئے بغیر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں اس لئے اور وہاں سے چل دیا۔ اس کے پیچھے اپنے استاد کے تعاقب میں چل دیئے تھے۔

○

نوید اور اس کے گینگ نے چند روز پہلے ہی شہر میں ایک موقع کا پلاٹ تازا تھا۔ یہ پلاٹ کسی بیوہ کی ملکیت تھا جس پر ایک کرائے دار قابض تھا۔ یہ قابض کسی سرکاری محکمے میں کلرک قسم کی کوئی چیز تھا اور اپنے محکماتی تعلقات کی آڑ میں بیوہ کے لئے باعث عذاب بنا ہوا تھا۔ جس مال دار بیوہ کا وہ کرایہ دار تھا۔ اس کے تین جوان بیٹے ملک سے باہر موج میلہ کر رہے تھے اور کلرک بادشاہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب وہ کبھی اپنی ماں کی خبر لینے نہیں آئیں گے۔ وہ خود ایک معمولی فلیٹ میں زندگی کے دن پورے کر رہی تھی اور اس کی ڈیڑھ کنال جگہ پر کلرک بادشاہ قابض تھا۔

جب بیوہ کو احساس ہوا کہ اس جگہ کی وہ اچھی خاصی قیمت وصول کر سکتی ہے تو اس نے محفوظ مستقبل کے لئے کچھ اثاثہ جمع کرنا ضروری جانا کیونکہ اسے پہاڑ ایسی زندگی ایسے ہی کاٹنی تھی۔ بیٹوں کے لئے اس نے بیوگی کے ایام کانٹوں کی بیج پر گزارے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے امریکہ بھاگ گئے اور اب لوٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ دو کا تو بے چاری کے پاس ایڈریس بھی نہیں رہا تھا۔

جب اس نے کلرک بادشاہ کو مکان خالی کرنے کا نوٹس دیا تو کلرک نے خالی کرنے

افرنے اسی کے گھر کا رخ کیا۔

کلرک بادشاہ کو اس نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ اس نے تو دو مرتبہ اس افسر کا تبادلہ کینسل کروایا تھا۔

”شاہ جی! آپ؟ یہ کیا چکر ہے بادشاہ؟ کیا مسئلہ ہے؟“

اس نے کلرک بادشاہ کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا جس کی خوف سے رنگت پیلی پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی کلرک بادشاہ کے ہاں بہت سے ذمہ دار آفیسرز جمع ہو چکے تھے۔ ان ذمہ داروں میں صوبائی لیگ کے مقامی صدر ہیڈن صاحب کے خاص آدمی بھی موجود تھے۔

”شاہ جی! کسی بات سے گھبرانا نہیں۔ ٹھوک کر بیان دو۔ ان غنڈوں کی اصلیت بے نقاب کر دو جنہوں نے اس شہر کا امن وامان تباہ کر رکھا ہے۔ یہ لوگ ملکی سالمیت سے کھلونے کی طرح کھیل رہے ہیں۔ ایسے حرام خوروں کو سزا ملنی چاہئے۔ طلباء برادری کے نام پر یہ دھبہ ہیں۔ یہ طالب علم نہیں غنڈے ہیں غنڈے.....“

”اور کیا جناب! ہمارا تو جینا دشوار کر دیا ہے انہوں نے۔“ ایک اور سپاہی در کرکے جوش آ گیا..... ”آئے روز فائرنگ“ آئے روز فائرنگ۔ جانے انتظامیہ کے کان پر جوں کیوں نہیں ریگیتی۔“

”انہیں تو تب ہوش آئے گا جناب جب یہاں سودو سولاشیں پھڑک رہی ہوں گی۔ ایک دو آدمیوں کے مرنے سے بات نہیں بنے گی۔ خدا جانے ان لوگوں کے ضمیر مر گئے ہیں۔ انہیں کیا مجبوری ہے کہ یہ قانون کا تقدس ہی بحال نہیں کر سکتے.....؟“ ایک سماجی در کرنے موقع کا فائدہ اٹھایا۔

”حضرات! میری بات کان کھول کر سن لیجئے۔ اگر ہم نے احکامات خداوندی سے اس طرح پہلو تہی جاری رکھی۔ اگر ہم نے مظلوموں کو اکیلا چھوڑ دیا۔ اگر ظالم اور وحشی درندے اس طرح دندناتے رہے اور شرفاء کی پگڑیاں اچھالتے رہے تو خدا کی قسم ہم پر خدا کا عذاب نازل ہوگا کہ پھر شاید ہماری داستان تک داستانوں میں باقی نہ رہے۔“

مقامی مسجد کے مولوی صاحب کی جو آئے روز طلباء کی غنڈہ گردیوں سے تنگ آ چکے

اور اس نے ایسا ہی کیا۔

اخبارات تو وہ مستقبل اور مفت پڑھتا رہتا تھا اور یہ بات اس کے علم میں تھی کہ انقلابی فیڈریشن کے دو گروپ بن چکے ہیں۔ اس نے کسی نہ کسی طرح بھاگ دوڑ کر گجر گروپ سے رابطہ کر لیا اور ابتدائی قسط بھی انہیں پہنچادی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کی مدد کریں تو مکان خالی کرنے کے جو تین لاکھ روپے وہ وصول کرنے جا رہا ہے اس میں سے کم از کم ایک لاکھ انہیں بھی ادا کرے گا۔

گجر گروپ نے اپنی جنگ کا آغاز اس کیس سے کیا۔ کلرک بادشاہ نے انہیں بتایا کہ آج شام کو نوید گروپ کی طرف سے اسے آخری وارننگ ملی ہے تو گجر نے اپنے تین چار لڑکے بندوقیں دے کر کلرک کے پاس بٹھادیئے۔

شام کو نوید گروپ کے لوگوں نے جب مکان پر بلہ بولا تو جواب میں کلاشکوفوں کی فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ نوید گروپ کے لوگ بھی یہاں شادی میں شرکت کرنے تو نہیں آئے تھے انہوں نے بھی بندوقیں سیدھی کر لیں۔ دونوں طرف سے مقابلہ شروع ہو گیا۔

پولیس حسب روایت تماشہ دیکھتی رہی۔

سیانے پولیس آفیسر جانتے تھے کہ اس کوئلوں کی دلالی سے منہ کالا کرنے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ انہوں نے بڑی ایمانداری سے غیر جانبداری کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا اور دونوں گروپوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر خود تتر بتر ہو گئے۔

پندرہ بیس منت تک دونوں ایک دوسرے پر کم اور ہوا میں زیادہ گولیاں چلاتے رہے۔ بالآخر گوہر مقصود اس طرح ہاتھ آیا کہ نوید گروپ کے حملہ آوروں کی فائرنگ سے ایک بے گناہ راہ گیر مارا گیا جبکہ دو بچے خوفزدہ ہو کر بھاگ رہے تھے وہ زخمی ہو گئے۔

○

جب میدان صاف ہوا اور دونوں گروپوں کے ”سورے“ اپنا اپنا کام کر کے چمپت ہو گئے۔ لوگوں نے دونوں زخمی بچوں اور قریب المرگ شخص کو ہسپتال میں پہنچا دیا تو پولیس کے جیلے دندناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بازار میں مورچے سنبھال لئے۔

حملہ آور چونکہ کلرک کے گھر پر فائرنگ کرنے آئے تھے اس لئے پولیس کے ذمہ دار

خدا جانے انہوں نے پانچ دس ہولڈنگ کارڈز کیسے تیار کر لئے تھے جن پر ان کے مطالبات بھی درج تھے۔

بھنڈر کو ایک ایک لمحے کی خبر پہنچ رہی تھی اور وہ اپنی کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ قدرت نے جیسے اچانک ہی اسے یہ ”بولس“ دے دیا تھا۔

شاید نوید گردپ کے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ گجر گردپ ان سے ٹکر جائے گا ورنہ پلاننگ ذرا بہتر کرتے۔

○

ملک صاحب کے لئے بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔ انٹیلی جنس کی رپورٹ جیسے ہی مرکز میں پہنچی۔ پارٹی کے وزیر صاحب نے ملک صاحب کو سوتے سے بیدار کر دیا۔

”ملک صاحب یہ کیا ہو گیا حضور! ہم تو مارے جائیں گے۔ چیئر مین صاحب کبھی اس غلطی کو معاف نہیں کریں گے۔ یہ آپ کے لونڈوں کو کیا سوچھی؟ ادھر الیکشن سر پر کھڑا ہے اور ہم کوئی بہتر موقع تلاش کر رہے ہیں کہ جیسے ہی عوام اپوزیشن کے خلاف بولناڑ ہوں، ہم الیکشن کا ڈول ڈالیں اور آپ کے لونڈے یہاں ہماری جڑوں میں پانی ڈالنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ ہوش کریں ملک صاحب کہیں ہمیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“

شاید وزیر صاحب کو پارٹی چیئر مین کی طرف سے اچھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ ہوئی تھی اور اب وہ اپنا غصہ ملک صاحب کی طرف منتقل کر رہے تھے۔

”میں ابھی لوٹا ہوں جو بد رہی صاحب! مجھے کچھ خبر نہیں کہ واقعہ کیا ہوا ہے۔ ایک اخبار نویس دوست نے سب کچھ بتایا ہے۔ بے فکر ہیں۔ میں بندوبست کرتا ہوں۔ بلاتا ہوں لڑکوں کو۔ ابھی تو مجھے حالات کا صحیح علم ہی نہیں ہوا کہ ہوا کیا ہے؟“

ملک نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے لہجہ ہیمایہ رکھنا مناسب سمجھا۔ وہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا اور معاملات کی تہہ میں اتر جانے والا۔

”ٹھیک ہے ملک صاحب۔ جیسے بھی ممکن ہو اس معاملے کو پیسہ رکھنے۔ خدا کے لئے کچھ ہماری عزت کا خیال کریں۔ ان لڑکوں کی باگیں ذرا کس کر رہیں۔ الیکشن تک صبر کر لیں ملک

تھے، غیرت ایمانی نے جوش مارا۔

”جناب والا! یہ سب کچھ ہماری کمزوری کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر ہم لوگ مل جائیں۔ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر چلیں۔ ایک دوسرے کے دکھ تکلیف میں کام آئیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان غنڈوں کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ ایک دانشور قسم کے صاحب بولے۔

اس دوران مقامی لیڈر صاحب اپنے گھر کا ایک چکر لگا کر واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے یہ چکر بے مقصد نہیں لگایا تھا۔ وہ ہجوم کے موڈ کی اطلاع بھنڈر صاحب کو دے آئے تھے اور ان سے تازہ ہدایات لے کر اب یہاں اپنی ”راج نیتی“ کے گل کھلانے آئے تھے۔

”ایس پی صاحب! آپ نے خود کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ گزشتہ آٹھ دس روز سے یہ لوگ یہاں روزانہ اودھم مچا کر چلے جاتے ہیں اور آپ کی پولیس اپنے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھی ہے۔۔۔۔۔۔ آپ صرف اس لئے ان غنڈوں پر ہاتھ نہیں ڈال رہے کہ انہوں نے طالب علموں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور درس گاہوں کی آڑ میں بد معاشی کے اڈے جمائے ہیں، لیکن ایس پی صاحب! بھولے بادشاہ یہ طالب علم نہیں ہیں۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کسی کالج میں نہیں پڑھتے۔ انہوں نے علم کے طلب گاروں کو بدنام کر دیا ہے۔ یہ طلباء نہیں ہیں۔ ان کی آڑ میں بد معاشی کرنے والے غنڈے ہیں اور آج ہم دیکھیں گے کہ یہ بچ کر کیسے جاتے ہیں۔“ انہوں نے تازہ تازہ چارج سنبھالنے والے ایس پی کے وہ لئے کہ بے چارہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

نوجوان ایس پی جس نے حال ہی میں اعلیٰ سول سروس میں اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی تھی اور حال ہی میں پولیس سروس جانن کی تھی اس اچانک صورت حال پر گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں موجود مجمع کو ٹھنڈا کرتا۔ بھنڈر کے ”جیالوں“ نے جواب یہاں پہنچ گئے تھے، اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ لوگ جلوس کی شکل میں اکٹھے ہوئے اور مقامی ہسپتال کی طرف چل دیئے۔ انہوں نے یہاں سے مقتول راہ گیر کی لاش حاصل کی اور مرکزی لیگ کے حامی مختلف اخبارات کے سامنے کھڑے ہو کر ”سیا پا“ شروع کر دیا۔ یہ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے بلند کرتے ہوئے نوید اور اس کے ساتھی غنڈوں کو قاتل قرار دے کر ان کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔

پھنسیا گیا ہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ حرام خور کلرک بھنڈر کے لڑکوں سے رابطہ قائم کر لے گا۔۔۔۔۔۔ ملک صاحب! گجر کے لڑکوں نے فائرنگ کی ہے۔ ہم تو جان بچانے کے لئے گولیاں چلا کر بھاگ رہے تھے اور راہ گیروں اور بچوں کو بھی انہوں نے جان بوجھ کر گولیاں ماری ہیں۔۔۔۔۔۔ ملک صاحب میں اس کلرک کا خون پی جاؤں گا۔“

وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ اس بڑھے نے دانت نکالے ہیں۔۔۔۔۔۔ دھوکے سے حملہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔ خیر! میں بھی اب اس سانپ کے دانت نکال کر ہی دم لوں گا۔ تم ایسا کر دجنتی جلدی ممکن ہو اپنے لڑکوں کے ساتھ روپوش ہو جاؤ۔ کسی بھی طرح یہاں سے دارالحکومت کی طرف نکل جاؤ، وہاں پناہ لے لینا اور میرا انتظار کرنا۔ خبردار کوئی گرفتاری نہ دے۔“

اس نے نوید کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اوکے سر!“ نوید نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں یہ لیتے جاؤ۔“

اس نے نوٹوں کا ایک بٹل اس کی طرف پھینک دیا۔

”ٹھہرو۔۔۔۔۔۔ ادھر سے نہیں ادھر سے۔“ اس نے نوید کو مین گیٹ کی طرف جانے سے روکتے ہوئے کہا۔

نوید کو اس نے کوشی کے عقبی حصے سے فرار کروایا تھا اور اب بڑی بے چینی سے اگلے حالات کی پلاننگ کر رہا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے اچانک ارسلان کی ضرورت محسوس کی۔

”ارسلان اب یہاں نہیں رہتا۔ اس نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔“ نجمہ بیگم نے اسے بتایا۔۔۔۔۔۔ ”اور وہ طلباء سیاست سے بھی علیحدگی اختیار کر چکا ہے جس کا اس نے ایک بھری پریس کانفرنس میں اعلان بھی کیا تھا۔“

”نجمہ! حالات کو سمجھو۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔“ ملک نے زچ آنے والے انداز میں کہا۔

”دیکھئے ملک صاحب! ہمارے درمیان ایک شریفانہ معاہدہ موجود ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بزنس میں دخل نہیں دیں گے۔۔۔۔۔۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی آپ کرنے جا رہے

صاحب! پھر پانچ سال تک جو جی چاہے کرتے رہیں، لیکن خیال رہے کہ ان حالات میں چیئر مین صاحب ہماری کوئی غلطی معاف نہیں کریں گے۔“

”خدا حافظ!“ ملک صاحب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی فون پر ان کی انگلیاں چلنے لگیں۔ اخبارات میں اپنے دوستوں سے انہوں نے معاملات کی اصلیت اور اہمیت دریافت کی۔ سوائے دو اخبار نویسوں کے اور کسی نے بھی تعاون کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی کیونکہ صورت حال بہت سنگین تھی۔

لوگ پہلے ہی طالب علموں کا لبادہ اوڑھ کر غنڈہ گردی کرنے والوں سے تنگ آ چکے تھے اور اب ان کی فائرنگ سے ایک بے گناہ مارا گیا اور دو معصوم بچے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

ملک کا پارہ آسمان کو چھونے لگا جب اس کے ملازم نے نوید کی آمد سے اسے مطلع کیا۔

”گدھے۔۔۔۔۔۔ الو کے پٹھے! یہ کیا کر دیا تم لوگوں نے؟ میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ میرے علم میں لائے بغیر کوئی کام نہ کرنا۔۔۔۔۔۔ اور اس پر تم یہاں بھی منہ اٹھا کر چلے آئے۔ گدھے! اگر پولیس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو۔۔۔۔۔۔ ادھر میرے خدایا! تمہاری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے۔۔۔۔۔۔؟“ اس نے غصے میں نوید کو گالیاں بھی بکٹی شروع کر دیں۔

نوید کے لئے ملک صاحب کا یہ لہجہ اور سلوک چونکا دینے والا تھا۔

غصے سے اس کا خون کھول اٹھا۔

لیکن۔۔۔۔۔۔!

اس نے فی الوقت جذبات پر قابو پانے میں ہی مصلحت جانی اور خاموشی سے سر جھکائے ملک صاحب کو ہڈ بان بکتے سنتا رہا۔

”ملک صاحب! پہلے میری بات سن لیں، پھر جو جی چاہے کہتے رہیں۔“ بالا خراس کا

پیاناہ صبر لبریز ہو گیا۔

”ہاں بکو! بکو! کیا بہانہ کرو گے۔۔۔۔۔۔؟“ ملک ابھی تک اپنا رل تھا۔

”دیکھئے ملک صاحب! پہلی بات تو یہ ہے میں یہاں اکیلا اور چھپ کر آیا ہوں۔ مجھے کسی نے یہاں آتے نہیں دیکھا۔ میں رکشہ میں بیٹھ کر آیا ہوں اور دوسری بات یہ کہ ہمیں چال میں

اضافہ۔ وہ یہ کہ آپ مکان کی چھت پر موجود تھے جب آپ نے نیلے رنگ کی بکیر سے جس کا نمبر آپ کے پاس موجود ہے نوید کو اترتے دیکھا۔“ گجر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
”نوید کو تو آپ پہچانتے ہی ہیں ناں.....؟“

”اوہو بادشاہو! یہ بھی کوئی بات ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ویسے بادشاہو! یہ نمبر ہے کس کا.....؟“ اس نے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔

”چھوڑ پیر جی! کالے چور کا نمبر ہے۔ آپ کو اس سے کیا۔ آپ آم کھائیں..... گٹھلیاں پولیس خود گنتی رہے گی۔ آپ کی کوئی کسی سے دشمنی تو ہے نہیں کہ آپ کسی کا نام لیں۔“ گجر بھی سمجھ گیا تھا کہ بندہ اپنی لائن پر ہے۔ ”اور پھر شاہ جی آپ کا تو یہ مسئلہ ہی نہیں۔ آپ نے تو صرف نیلے رنگ کی بکیر کو دیکھا ہے اور اس کا نمبر نوٹ کر لیا..... مطمئن رہیں آپ کے علاوہ بھی تین چار لوگوں نے اس نیلی بکیر کو دیکھا ہے جس میں سے نوید باہر نکلا اور اس نے فائرنگ کی تھی..... بکیر وہاں کھڑی رہی اور پانچ چھ منٹ تک نوید فائرنگ کرنے کے بعد اسی میں بیٹھ کر فرار ہوا لیکن آپ نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا۔ آپ تو فائرنگ کی آواز سن کر چھپ گئے تھے۔ آپ نے صرف بکیر کو نوید کو دیکھا ہے.....!“ بھنڈر کے ایک اور چچے نے جو شکل ہی سے پیشہ درگواہ لگتا تھا، کلرک بادشاہ سے کہا۔

”بے فکر رہو بادشاہو! ہم نے بھی دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔ ساری زندگی سرکاری دفاتر میں جھک ماری ہے..... ایسا بیان لکھواؤں گا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“
”اچھا ہم چلتے ہیں۔ ابھی انسپکٹر صاحب آئیں گے۔ آپ انہیں بیان لکھوادیں۔“
بھنڈر نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

گجر سمیت اس کے سارے چچے جو اس کے ساتھ آئے تھے باہر نکل گئے۔ یہ لوگ پولیس والوں کے آنے تک یہاں رکتا نہیں چاہتے تھے۔

”شاباش! پہلی مرتبہ کامیابی کا منہ دیکھا ہے، لیکن اس میں بھی تمہاری محنت سے زیادہ قسمت کا دخل ہے۔ نوید اور اس کے ساتھی اپنی جان چھپاتے پھر رہے ہوں گے۔ یہی موقع ہے کہ سالوں کو پیس کر رکھ دو..... اور ہاں وہ کیا نام تھا اس ٹرانسپورٹر یونین والے کا..... اس کو تو ایسا مزہ چکھانا کہ زندگی بھر دوبارہ اس پیشے میں منہ نہ مارے۔ سال! بڑا لیڈر بنتا ہے۔ صبح یہ کام شروع ہو

ہیں۔ جو ہم دونوں کے لئے غلط بات ہے۔“ اس نے کمال لا پر دہی سے جواب دیا۔

”ادبہ! تو یہ بات ہے۔“ ملک کا ہاتھ اپنی مونچھوں پر چلا گیا۔

اس نے اچانک ہی ایک اور اہم فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

اس فاحشہ سے جان چھڑانے کا فیصلہ.....!

اب یہ عورت اس کے کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ اس جیسی ایک اور ہوس کی ماری نجمہ اس نے دیکھ لی تھی۔

”اوکے! میں دیکھتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

○

کلرک بادشاہ اس وقت بھنڈر کے سامنے موجود تھا جو اس کے محلے میں رہنے والے لیڈر کے گھر پہنچ گیا تھا۔

”شاہ جی! ہم تو غلام ہیں آپ کے۔ کسی بات سے گھبرانا نہیں۔ کوئی مائی کالا آپ سے یہ لاکھوں کی جائیداد نہیں چھین سکتا۔ شاہ جی! ہم جو ہیں بس ذرا بیان ٹھوک بجا کر لکھانا ہے۔ میں نے ڈی آئی جی سے بات کر لی ہے۔ پشیشل گارڈ آپ کی حفاظت کے لئے کھڑی کر دیں گے۔ پھر ہمارے اپنے لڑکے کیا کم ہیں..... اور ہاں یہ بھی رکھ لیجئے۔ ہم ذرا پکی دوستی کے قائل ہیں.....!“ بھنڈر نے ہزار کے دس نوٹ اس کی طرف بڑھادیئے۔

دراصل انہیں عادت ہو گئی تھی کہ ان کا ہاتھ نوٹ دیکھتے ہی بے اختیار پلکتا تھا۔
”بس شاہ جی! اپنے بیان میں معمولی سا اضافہ کرنا ہے۔“ بھنڈر نے مسکراتے ہوئے ایک چٹ اس کی طرف بڑھادی۔

”یہ کیا ہے جناب.....؟“ شاہ جی نے حیرانگی سے پوچھا۔

”نمبر ہے پیر جی۔ نیلے رنگ کی بکیر وگاڑی کا نمبر.....!“ اس مرتبہ بھنڈر کی بجائے گجر نے جواب دیا جو بھنڈر کے ساتھ ہی آیا تھا۔

”میں سمجھا نہیں جناب.....!“ کلرک بادشاہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”شاہ جی! آپ نے اپنے بیان میں معمولی اضافہ کرنا ہے..... صرف ایک فقرے کا

جانا چاہئے..... ایسی کی تہیسی کر کے رکھ دو سب کی..... سالوں کو تانی یاد دلا دو۔ میدان خالی ہے بچہ! میدان مار لو..... یہ موقعے روز روز نہیں ملا کرتے۔ صبح ایسا ابجی ٹیشن ہوتا چاہئے کہ ملک اور اس کے کرتا دھرتا اپنا منہ چھپاتے پھریں۔ بس اب جاؤ..... اللہ نیلی!“ بھنڈر نے اپنی جیب میں بیٹھتے ہوئے گجر کو الگ لے جا کر کہا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر اسے چڑھ جا سولی رام بھلی کرے گا کا مژدہ سنا کر جہنم میں جھونک دیا۔

○

دوسرے روز انقلابی فیڈریشن کے ”گجر گروپ کا دن“ تھا..... ان لوگوں نے شام گئے تک شہر کی سڑکوں پر ادم چمچائے رکھا..... شہر کے تمام اخبارات کے دفاتر کے سامنے انہوں نے ہنگامہ آرائی کی تھی اور نوید اور اس کے ساتھیوں کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کیا تھا۔ گجر گروپ نے دوپہر کو اپنے ابجی ٹیشن کا آغاز ایک پریس کانفرنس سے کیا جو میں الزام لگایا گیا کہ غنڈوں کی سربراہی ملک صاحب کر رہے ہیں اور اخبارات نے اپنی خبروں میں کلرک بادشاہ کے حوالے سے جو بیان شائع کیا ہے اس میں کلرک بادشاہ اور دوسرے تین چار راہ گیروں نے جس نیلے رنگ کی ہجیرہ کی نشاندہی کی ہے وہ ملک صاحب کی ہجیرہ ہے۔ انہوں نے صوبائی قیادت سے اپیل کی تھی کہ اگر انہیں صوبے میں امن وامان درکار ہے تو قاتلوں کو ان کے پشت پناہوں سمیت گرفتار کیا جائے۔ بصورت دیگر وہ خود معاملات کو ہاتھ میں لینے پر مجبور ہوں گے۔“

ملک کو گرفتار کرو.....!

قاتل قاتل ملک قاتل.....!

غنڈی گردی ہائے ہائے.....!

افسر شاہی نہیں چلے گی.....!

طلباء کا مجرم ملک ہے.....!

اور ایسے ہی بے شمار نعروں کے ساتھ طلباء میدان میں نکل آئے۔

شام تک دو تین جگہ ان کا پولیس سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں پولیس کو ناکوں چنے چبوا کر رکھ دیئے تھے۔

جس ٹرانسپورٹ یونین نے کچھ عرصے پہلے نوید گروپ اور مرکزی لیگ کی حمایت کی تھی

ان کے ایک سٹینڈ پر حملہ کر کے طلباء نے تین چار دیکنوں کو پلک جھپکتے میں جلا کر رکھ کر دیا تھا۔ وہ آندھی کی طرح آئے اور دیکنوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا کر طوفان کی طرح چلے گئے۔ انہوں نے اڑے میں موجود قریباً تمام ڈرائیوروں کا مار مار کر بھر کس نکال دیا تھا۔

شام گئے بھنڈر صاحب کو وزیر اعلیٰ نے خصوصی اجلاس میں مشاورت کے لئے طلب کیا تھا جہاں بھنڈر صاحب نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ طلباء کو ضرور قابو کر لیں گے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے ایک شرط بھی عائد کر دی تھی۔

”دیکھئے آئی جی صاحب! میں سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں۔ پولیس کی نا انصافی کے خلاف طلباء کو احتجاجاً میدان میں آنا پڑا اور اس کی وجہ آپ کے نالائق افسران ہیں۔ ملک صاحب کے لڑکے سارے شہر میں بد معاشی کرتے پھر رہے ہیں اور کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا..... آٹھ دس روز سے وہ لوگ اس غریب کے گھر پر فائرنگ کرنے آرہے تھے..... انہوں نے اس بے چارے بے گناہ اور مظلوم کلرک پر قاتلانہ حملہ کیا اور آپ نے کسی کو گرفتار نہیں کیا۔ اب آپ کو ثبوت مل چکا ہے کہ یہ سب کس کا کیا دھرا ہے؟ آپ جانتے ہیں جس ہجیرہ میں بیٹھ کر وہ غنڈے جنہیں طالب علم کہنا علم کی توہین کرنے کے مترادف ہے آئے تھے۔ اس کا مالک کون ہے؟ آئی جی صاحب! اس صوبے میں خدا کے فضل سے بڑی مضبوط حکومت ہے اور ہم سینٹر سے ڈرنے والے نہیں ہیں..... اگر کوئی اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ ہمیں دبا لے گا تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ میں آپ سے صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ کو بہر صورت ملک صاحب کو گرفتار کرنا ہوگا۔ یہی صورت ہے صوبے میں امن وامان قائم کرنے کی.....!“ بھنڈر نے اپنی تقریر بڑے جذباتی انداز میں ختم کی تھی۔

”آپ کو اس بات میں اعتراض بھی نہیں ہونا چاہئے“ آخر ان کے خلاف گواہیاں موجود ہیں اور ہم کسی سے ناجائز سلوک نہیں کرنے جا رہے۔ آئی جی صاحب لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال کو بہتر کیجئے۔ ہمیں کل عوام کی عدالت میں بھی جانا ہے وہاں کیا منہ لے کر جائیں گے۔ برائے مہربانی ان مصلحتوں کو ایک طرف رکھئے اور اپنا فرض ادا کیجئے۔“ بھنڈر کے دوسرے ساتھی نے آئی جی کو لقمہ دیا۔

آئی جی نے ایک مرتبہ وزیر اعلیٰ کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر الجھن کے آثار تھے

ہو رہا تھا۔

ملک صاحب نے اپنا بریف کیس ایکسپریس مشین پر رکھا اور کلیئر ہونے پر بریف کیس اٹھا کر نزدیکی کاؤنٹر پر سیٹ نمبر لینے کے لئے آگے بڑھے۔ تین چار سفید پوشوں نے جو شاید ان ہی کے منتظر تھے انہیں گھیرے میں لے لیا۔

”ہمارے پاس آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں جناب۔“ ان میں سے ایک نے جو شاید ان کا آفیسر تھا ملک صاحب کو مخاطب کیا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا.....؟“ ملک نے غصے سے انہیں ڈانٹ دیا تھا۔

”سر! ہمیں غلط رویہ اپنانے پر مجبور نہ کیجئے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ جیسی محترم شخصیت کو ہتھکڑی لگا کر تھانے لے جاؤں.....!“ آفیسر خاصا دلیر اور سلجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”اوکے.....!“ ملک صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے۔

جہاز رن وے سے اٹھ کر دارالحکومت کی طرف پرواز کر رہا تھا جب کہ ملک صاحب کو پولیس کی ایک جیپ کو توالی کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس جیپ میں نصب وائرلیس کے ذریعے یہ اطلاع دو تین جگہ پہنچادی گئی تھی کہ مشن کامیاب رہا.....!



لیکن پھر وزیر اعلیٰ صاحب نے بھی اثبات میں گردن ہلا دی۔

”ٹھیک ہے جناب! ہم اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کریں گے لیکن آپ ذرا طلباء کو سنبھالئے۔“ آئی جی صاحب نے کہا۔

اور.....!

بھنڈرا اپنے پلان کے مطابق پارٹی کی اعلیٰ کمان کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے گماشتوں کے ذریعے معصوم طلباء کو درغلا کر سڑکوں پر نکال کر ان کو اور پولیس کو آپس میں ٹکرا کر لاء اینڈ آرڈر کی دھجیاں بکھیر دی تھیں اور اب خود ہی اس کھیل کو ختم بھی کرنے جا رہا تھا۔

اسے امید تھی کہ اب پارٹی قیادت ٹکٹوں کی تقسیم کا فیصلہ ذرا سوچ سمجھ کر ہی کرے گی۔



شام ڈھلے ملک صاحب کو مرکزی وزیر کا فون موصول ہوا تھا.....!

”ہماری اطلاع کے مطابق آپ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے والے ہیں۔ آپ نزدیک ترین فلائٹ سے دارالحکومت پہنچ جائیے۔ باقی معاملات ہمیں طے کر لیں گے۔“

”اچھا تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے..... بھنڈر کی یہ ہمت۔ ذات کی کوڑھ کر لی اور شہتیروں سے چھپے.....!“ ملک صاحب کا خون کھولنے لگا تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں کسی نے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔

”ملک صاحب پلیز! حالات کو سمجھئے۔ فی الوقت خاموش رہنے ہی میں مصلحت ہے۔ اپ پلیز آدھ گھنٹہ بعد روانہ ہونے والی فلائٹ میں نکلئے۔ ہم آپ کو ایئر پورٹ پر ریسیو کرنے آ رہے ہیں..... اچھا خدا حافظ۔ فون پر زیادہ بات مناسب نہیں۔“

”خدا حافظ.....!“ ملک نے فون بند کر کے گھڑی پر نظر ڈالی۔

اسے علم تھا کہ آدھ گھنٹہ بعد ایک فلائٹ دارالحکومت روانہ ہوگی۔ ایئر لائن میں اپنے ایک ”خاص آدمی“ کے ذریعے اس نے فرسٹ کلاس کی ایک سیٹ حاصل کر لی تھی۔

وہ بڑی افراتفری میں ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اپنے ڈرائیور کو اس نے کار پارکنگ سے ہی رخصت کر دیا تھا اور اب خود لاؤنج کی طرف جا رہا تھا۔ فلائٹ کی روانگی کا اعلان

اس رشتے دار کے گھر جہاں وہ قیام پذیر تھا، اپنے ہونٹ کی طرف جا رہا تھا تو اچانک ہی ایک جیپ کے ٹائرز زور سے چرچرائے اور جیپ اس کے نزدیک آ کر رک گئی۔ اس سے پہلے کہ اسے کچھ سمجھ آتی، دو مضبوط ہاتھوں نے اٹھا کر اسے جیپ میں پھینک دیا۔

”کیا کیا بات ہے؟ کون ہو تم لوگ؟“ کلرک بادشاہ کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ نجانبے اس کے حلق سے کیسے یہ گھٹی گھٹی سی آواز برآمد ہوئی تھی۔ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن خوف سے اس کی کھکھی بندھی ہوئی تھی۔

اپنے سوال کا جواب اسے زوردار تھپڑ کی شکل میں وصول ہوا تھا، اس کے ساتھ ہی اسے سختی سے خاموش رہنے کی تنبیہ کی گئی۔

کلرک بادشاہ کو اب بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دس منٹ کے اس راستے میں ہزار مرتبہ گزر گزرتے ہوئے ان لوگوں سے نجانبے کون کون سے واسطے دے کر قصور اور ان کا جغرافیہ جاننے کی خواہش کی تھی، لیکن یہ لوگ نجانبے کس مٹی کے بنے تھے۔ وہ اس بات کی بات سننے کے بجائے اس کا تسخیراڑا رہے تھے اور کبھی کبھی ایک آدھ چپت بھی اسے جمادیتے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی کھلونا ان کے ہاتھ لگ گیا ہو۔

ایک شاندار عمارت میں وہ جیپ سمیت داخل ہوئے اور انہوں نے کلرک بادشاہ کو ”ڈنڈا ڈولی“ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اٹھا کر ایک کمرے میں پھینک دیا تھا جس کو باہر سے لاک کر دیا گیا۔ کمرے میں صرف ایک قالین نمادری بچھی ہوئی تھی اور ایک کونے میں اس جیسا کوئی اور مصیبت زدہ بیٹھا اپنے زخم سینک رہا تھا۔

کلرک بادشاہ کے گرنے کی آواز جب دھپ ہے بلند ہوئی تو اس نے گردن اٹھا کر ”نئے شکار“ کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنی پوزیشن میں واپس آ گیا۔

اس کے جسم پر کپڑوں کے نام پر چھتھرے جھول رہے تھے اور چہرے پر ایسے نشانات پڑے تھے جیسے گزشتہ سال سے اسے سوائے مار کھانے کے اور کوئی کام نہ رہا ہو۔ داڑھی کے بے ترتیب بال یہ بتانے کے لئے کافی تھے کہ یہ اپنی مرضی سے نہیں رکھی گئی بلکہ گردش حالات نے چہرے پر جمادی ہے۔

”بھائی صاحب! بھائی صاحب!“ شاہ جی نے سہمے سہمے لہجے میں اسے مخاطب کیا

فاتح

جس روز کلرک بادشاہ کو تادلے کے احکامات ملے، اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ وہ مرکزی سرکار کا ملازم تھا جس نے ایک ترقی دے کر کلرک بادشاہ کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اسے فوراً رپورٹ کرنے کو کہا گیا تھا۔ خلاف توقع نوکری میں ایک ترقی نے اسے ضرورت سے زیادہ ہی خوش کر دیا تھا۔ اس کے پرانے ساتھیوں نے کہا تھا۔

”شاہ جی! مرکز میں نہ جاؤ۔ کوئی اور ہی چکر نہ چل جائے۔“

لیکن.....!

شاہ جی اپنی افسری کی دھن میں کسی کو خاطر میں نہیں لارہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مرکز سے دوبارہ تادلہ کروا کے اسی شہر میں واپس آنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بس ذرا رپورٹ ہی کرنی تھی اور اسی چکر میں مہینہ دو مہینے وہاں گزارنے تھے جس کے بعد وہ ہوتے اور افسری کے مزے۔

کلرک بادشاہ تیسرے ہی روز چارج لینے دار الحکومت اپنے مرکزی دفتر میں پہنچ گیا۔ پہلے روز تو اس نے معمول کے مطابق چارج ہی لیا تھا، لیکن دوسرے روز جب وہ اپنے

اسے یقیناً دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔

دونوں نے اپنے افسر اعلیٰ تک پہنچتے پہنچتے شاہ صاحب کی ایسی دھنائی کر دی تھی کہ اسے اپنی ہیئت بدلتی محسوس ہو رہی تھی۔

جیسے ہی اسے دونوں نے اپنے افسر اعلیٰ کے سامنے پیش کیا۔ کلرک بادشاہ نے ”بچالو۔ مجھے خدا کے لئے بچالو۔ میری توبہ..... آپ جیسے حکم دیں گے میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ چلاتے ہوئے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

افسر اعلیٰ نے آنکھ کے اشارے سے دونوں کو باہر جانے کے لئے کہا اور کلرک بادشاہ کو پاؤں کی ٹھوکر مارتے ہوئے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔

”آیا دماغ ٹھکانے؟ اب پتہ لگا کہ جھوٹی گواہیاں دینے کا انجام کیا ہوتا ہے؟“ افسر اعلیٰ نے پھسکارتے ہوئے کہا۔

”سمجھ گیا جناب۔ بالکل سمجھ گیا۔ جیسے آپ فرمائیں گے میں ویسے ہی کروں گا۔“ اس نے کھسکھساتے ہوئے ہاتھ باندھ دیئے۔

”اوئے میں نے تو سنا تھا تم بہت عقل مند اور بڑے جی دار ہو، لیکن تم تو پرلے درجے کے گدھے اور بزدل نکلے۔ الو کے پٹھے اگر اتنا حوصلہ نہیں تھا تو پھر پڑگا لینے کی کیا ضرورت تھی۔“ اعلیٰ افسر نے اسے بے شمار گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔

”غلطی ہوگئی مائی باپ۔“ کلرک بادشاہ پر ابھی تک کچپی طاری تھی۔

”غلطی کے بچے۔ مجھے تمہاری حالت پر رحم آرہا ہے۔ بال بچے دار آدمی ہو اور سرکاری ملازم بھی ہو۔ ہمیں تو حکم ملا تھا کہ تمہیں گولی مار کر تمہارا ”مذا“ ہی ختم کر دیا جائے لیکن میں خدا خوفی کرتے ہوئے تمہیں غلطی کے ازالے کا موقع دلاتا ہوں۔ حرام خور مرکزی محکمے کے ملازم ہو کر تو نے ایسی جرات کیوں کر لی۔ تو نہیں جانتا حکومت کے ہاتھ کتنے لمبے ہوتے ہیں۔“

پندرہ بیس منٹ تک اس نے شاہ صاحب سے فتیس کروائیں۔ پھر انہیں سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی۔

تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب کو چائے اور ایک پیٹری پیش کی جا رہی تھی جو بدقت تمام ان کے حلق سے نیچے اتری۔

لیکن وہ تو بس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ بمشکل ان کی ”بھائی صاحب، بھائی صاحب“ کی گردان پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تاجتی وحشت نے کلرک بادشاہ کو لرزہ کر رکھ دیا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟ کون لوگ ہیں؟“ کپکپاتے ہونٹوں سے دریافت کیا۔

جواب میں تلخ سی مسکراہٹ اس شخص کے چہرے پر نمودار ہوئی اور اس نے اپنی گردن دوبارہ جھکا لی۔

”جان لوگے..... جان لوگے..... لیکن فائدہ کیا؟ یہاں سے بچ کر تو جاؤ گے نہیں۔ کسی کو بتا تو سکو گے نہیں۔ پھر فائدہ کیا.....؟ پھر فائدہ کیا.....؟“ وہ پاگلوں کی طرح تھپتھپے لگانے لگا۔

شاہ جی پر دوبارہ لرزہ طاری ہو گیا۔

انہوں نے سر کے باپ دھوپ میں تو سفید نہیں کئے تھے۔ کلرک بادشاہ کو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ لوگ انٹیلی جنس کے تھے اور اب وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے صوبائی لیگ کے کہنے پر جھوٹا بیان دیا تھا۔ اس کے بعد سے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ مرکزی پارٹی کے لوگ اسے یونہی چھوڑ دیتے۔ اس نے الیکشن کے نزدیک ان لوگوں کی سادھ کو معمولی نقصان تو نہیں پہنچایا تھا۔

”اف میرے خدایا! میں تو مارا جاؤں گا۔“ اس نے سوچا اور دل ہی دل میں کہا۔

”شاہ جی کچھ کرو۔ کچھ سوچو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔“ اس نے خود کو حوصلہ دیا اور پھر ”یامکاری تیرا ہی آسرا“ کا نعرہ لگا کر آنے والے حالات کا منتظر ہو کر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ وہاں موجود شخص کا شاید ذہنی توازن خراب تھا کیونکہ اول تو وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ اگر کچھ کہتا بھی تو ایسے فلسفیانہ انداز میں جو کلرک بادشاہ کی فہم و فراست سے بالاتر ہوتا۔ آدھ گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور جن دو شکلوں پر کلرک بادشاہ کی نظر پڑی، اس نے توبے چارے کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ یہ آدمی کم اور بھوت زیادہ نظر آتے تھے۔ لمبے ترنگے، بڑی بڑی مونچھوں اور خونخوار آنکھوں والے۔

ان میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر کلرک بادشاہ کو گردن سے ایسے پکڑا تھا جیسے وہ کوئی ذبح ہونے والی مرغی کو پکڑ رہا ہو۔

”ادھر آؤ شاہ جی! سنا ہے بڑی گواہیاں دیتے ہو۔“ اس نے شاہ صاحب کو جھٹکا مارا تو کلرک بادشاہ دوسرے پر جا گرا جس نے اٹے ہاتھ کا جھانپڑا اسے رسید کیا اور وہ چکرا کر رہ گیا۔

اگلے روز پہلی فلائٹ سے ملک صاحب دارالحکومت روانہ ہو گئے۔
کلرک بادشاہ کا پلان انہوں نے یہیں بیٹھ کر تیار کیا تھا اور اس ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے جا رہے تھے۔

○

بڑے پیمانے پر پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی اخبارات کے نمائندے بھی موجود تھے اور شاہ صاحب ایک بڑی کرسی پر میز کے سامنے براجمان تھے۔

ان کا بیان شروع ہوا اور تمام اخبار نویس گوش برآواز ہو گئے۔

”میرا نام فقیر حسین شاہ ہے اور میں مرکزی محکمے کا ملازم ہوں۔ مورخہ 3 ستمبر کو میرے آبائی شہر میں فائرنگ کا جو دو قہ میرے گھر پر ہوا وہ خالصتاً غیر سیاسی تھا اور مکان کے لین دین کے تنازعے پر دو متحارب فریقوں میں جو دونوں سوئے اتفاق سے طلباء تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے فائرنگ ہوئی جس کے بعد صوبائی لیگ کے معزز عہدے دار بھنڈرا صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں پولیس رپورٹ میں ملک صاحب کا نام بھی شامل کرواؤں۔ اس ضمن میں مجھے لالچ بھی دیا گیا اور دھمکیاں بھی۔ میں ایک غریب اور دوسرے درجے کا ملازم پیشہ آدمی ہوں۔ اس لئے میرے پاس صوبائی لیگ کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔“

”تمہیں اپنا گزشتہ بیان بدلنے پر کس نے مجبور کیا؟“ صوبائی لیگ کے ایک نمک خوار اخبار نویس نے پہلا گولہ داغا۔

”ملک صاحب کی شرافت نے۔“ کلرک بادشاہ کا جواب گو کہ پہلے سے تیار شدہ سکرپٹ میں شامل نہیں تھا، لیکن وہ بھی حق نمک ادا کرنے پر تل گیا تھا۔ یوں بھی اس کی زمانہ ساز نظروں نے دیکھا لیا تھا کہ ابھی اس پارٹی کے لئے حکومت کرنے کے خاصے مواقع موجود ہیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اسی اخبار نویس نے تملاکر پوچھا۔

”جب ملک صاحب ضمانت کروانے کے بعد مجھے ملنے آئے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میری ان سے کیا دشمنی ہے۔ ملک صاحب نے کہا۔ ”شاہ جی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں اس سے پہلے آپ سے نہیں ملا۔ اگر ملا بھی تھا اور نادانستگی میں کوئی غلطی کر بیٹھا تو آپ مجھے

اس اثنا میں وہاں مرکزی لیگ کا ایک نمائندہ بھی آ گیا۔ شاہ صاحب کو اس کی شکل جانی پہچانی دکھائی دے رہی تھی، لیکن اس وقت اسے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ شخص کون ہے۔ فی الوقت تو اسے موڈیوں کے شکنجے سے خود کو آزاد کروانا تھا۔

جانی پہچانی شخصیت نے اسے ایک بیان ازبر کر دیا جو اس نے ایک پریس کانفرنس میں جو آج سے تین چار روز بعد مرکزی دارالحکومت میں منعقد کی جا رہی تھی دینا تھا۔ اس درمیان کلرک بادشاہ کے بیوی بچے اور گھر کا سارا سامان یہیں ایک مکان میں منتقل ہونا تھا جو اسے سرکاری ملازمین کے کونے میں الاٹ کیا گیا تھا۔

اس کی منتقلی کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

○

بھنڈرا کا مقصد تو ملک صاحب کو ایک مرتبہ حوالات کی ہوا کھلا کر ان کی ہوا اکھاڑنا تھا جس میں اس نے بہر صورت کامیابی حاصل کر لی تھی۔ جب اسے یہ خبر ملی کہ اگلے ہی روز ملک صاحب کی اعلیٰ عدالت سے ضمانت پر رہائی ہو گئی ہے تو اس نے اس خبر کا کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا۔ اس نے اپنی دانست میں اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر لی تھی۔

لیکن.....!

ابھی اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ملک اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اس نے لاعلمی میں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

ملک صاحب جب ضمانت پر رہا ہو کر باہر آ رہے تھے تو مرکزی لیگ کے ہزاروں کارکن ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اخبار نویسوں کی فوج ظفر موج اس کے علاوہ تھی۔

ملک صاحب نے ان کے تمام سوالات کے جوابات بڑی خندہ پیشانی سے دیئے تھے اور اشارتاً بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ انہیں اس چکر میں کس نے پھانسا ہے۔ اخبار نویسوں نے ملک صاحب کی زبان سے بھنڈرا کا نام اگلو آنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی لیکن ملک صاحب نے..... ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی تھی اور یہی کہا تھا کہ وہ اچھی حرکت کا جواب اپنی سطح سے اتر کر نہیں دے گا اور سیاست میں شرافت کا چلن نہیں بدلے گا۔ ملک صاحب نے اخبار نویسوں سے کہا تھا کہ وہ لوگ بہت جلد سچائی کو منظر عام پر آتا دیکھ لیں گے۔

کرتا تھا تو یہ اصولاً کوئی غلط بات نہیں۔ اگر آپ نے اس میں بھی کیڑے نکالنے ہیں تو آپ کی مرضی۔“

شاہ صاحب کے اس جواب کے بعد اس مجمعے میں موجود صوبائی لیگ کے تنخواہ دار اخبار نویسوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کا واسطہ بڑے کانیاں آدمی سے پڑا ہے جس کو سارے سبق زبانی یاد کروانے کے بعد ہی میدان میں اتارا گیا ہے۔

اگلے روز کے اخبارات کی چیختی چلاتی سرخیوں نے صوبائی لیگ کی سیاسی ساکھ کو زبردست دھچکا لگایا تھا اور بھنڈر کو تو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کس منہ سے پارٹی اجلاس میں شرکت کر سکے گا۔

ملک سے اتنے اچانک اور ایسے بھرپور جواب کی اسے توقع نہیں تھی۔ یہ بات وہ سمجھتا تھا کہ اگر کلرک بادشاہ کو اس نے سوتے میں تول کر بھی ایک اور پریس کانفرنس کے لئے راضی کر لیا تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا کیونکہ دوسری مرتبہ اپنا بیان بدلنے والے کو لوگ دروغ گو اور لالچی ہی کہہ سکتے تھے اسے سچا سمجھنے کو کوئی تیار نہ تھا۔

پھر.....!

یہ بھی تو ممکن تھا کہ ملک اگلی مرتبہ اس سے بھی تیز ہتھیار کے ساتھ حملہ آور ہوتا۔ کسی ایسے ہتھیار کے ساتھ جو اس کی سیاسی موت پر مہر تصدیق ثابت کر دیتا۔

○

چھت پر بیٹھے فوٹو گرافر کو اگر کوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی کرتا تو نہ دیکھ پاتا۔ یوں بھی آج تہوار کی وجہ سے مکانوں کی چھتوں پر خاصی رونق لگی ہوئی تھی اور نیچے لان میں موجود کسی شخص کے اس طرف دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

طاقت ور لینز اپنے کمرے میں لگا کر فوٹو گرافر نے لان میں دھری تین کرسیوں کو فوکس کر رکھا تھا۔ ارسلان نے اسے کہا تھا کہ پیسے اس نے اپنی مرضی کے لئے ہیں، کام ارسلان کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے۔ ”جناب فکر ہی نہ کریں۔ انشاء اللہ آپ خوش ہو جائیں گے۔“ فوٹو گرافر نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اپنی پیشہ ورانہ اہلیت کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

”او کے..... میں چلتا ہوں۔“

معاف کر دیں۔“ مجھے تو یہ امید تھی کہ ضمانت کے بعد بھنڈر صاحب کی طرح مجھ پر اپنے پروردہ غنڈوں سے حملہ کروائیں گے کیونکہ وہ تو تھے بھی حق بجانب، لیکن میری توقعات کے بالکل برعکس جب انہوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تو میری غیرت اور شرافت جوش میں آئی۔ مجھے تب اندازہ ہوا کہ میں نے بھنڈر صاحب کے کہنے پر کتنے با اصول اور عظیم انسان کی پگڑی اچھالی ہے۔“

”تمہاری اس پریس کانفرنس کا خرچہ کس نے برداشت کیا؟“ ایک اور نمک خوار آگے بڑھا۔

”کیا آپ لوگ پریس کانفرنس میں آنے کے پیسے لیتے ہیں؟“ شاہ جی کے جواب پر ساری محفل نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس اخبار نویس کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”میرا عرض کرنے سے مطلب یہ تھا کہ اس میں خرچ والی بات ہی کیا ہے۔ میں نے اس پریس کلب کے سیکرٹری صاحب سے گزارش کی تھی کہ میں اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا اور ایک اہم قومی راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ بطور اخبار نویس آپ اس قومی خدمت میں میرا ساتھ دیں کیونکہ ایکشن نزدیک آرہے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی عمل کی وجہ سے عوام کسی غلط فہمی کا شکار رہیں۔“

شاہ صاحب کا ہر جواب پہلے پہلہ تھا۔

”شاہ صاحب ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے صلے میں جناب کو ایک سرکاری کوارٹر بھی تو الاٹ ہوا ہے اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے؟“ ایک اور اخبار نویس دور کی کوڑی لایا۔

شاہ صاحب بھی مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے اور جو لوگ انہیں یہاں تک لائے تھے انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ شاہ صاحب پر کس کس کارز سے حملے ہوں گے۔ انہوں نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل کھولی اور اس میں سے ایک فوٹو سٹیٹ نکال کر اپنے قریب موجود پریس کانفرنس کے سیکرٹری کو تھما دی۔ اس کے بعد وہ اخبار نویس سے مخاطب ہوئے۔

”اگر 25 سال کی سروس کرنے کے بعد مجھے استحقاق کی بنیاد پر ایک کوارٹر الاٹ ہو گیا ہے جس کے لئے میں نے آج سے بارہ سال پہلے درخواست دی تھی جب میں اس شہر میں مگر کی کیا

لئے۔ اب وہ بجا طور پر خود کو فاتح کہہ سکتا تھا۔

”واہ ارسلان باؤ! تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں سے تمہارے تعلقات ہیں اس کا تو مجھے اندازہ ہی نہ تھا۔“ مسز ملک کے واپس جاتے ہی مختار اس بیگم نے اس پر صدقہ داری ہونا شروع کر دیا تھا۔

”تم دیکھتی جاؤ بی بی! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اب تمہیں علم ہو گیا تاں کہ جو کام ہم کر رہے ہیں وہ اصل میں کس کا ہے۔ بس بے دھڑک ہو کر کام کرو۔ دو تین چکر بھی تم نے کامیاب لگائے تو سمجھو تمہارے وارے نیارے ہو گئے۔ بی بی! کروڑوں میں کھیلو گی، کروڑوں میں۔ جب تم اس شہر کی سڑکوں پر بحیرہ میں بیٹھ کر گھومنے نکلو گی تو سارے شہر کے شرفاء تمہیں جھک جھک کر سلام کیا کریں گے۔ بی بی! تمہارا ماضی کسی کو یاد نہیں آئے گا۔ تمہیں بھی نہیں۔ اپنے نام کے ساتھ کسی بھی اعلیٰ ذات کا اضافہ کر لینا۔“

ارسلان کی بات پر مختار اس نے زبردست قہقہہ بلند کیا تھا۔

○

ریاست شاہ کا تعلق اس خاندان سے تھا جو ملک کی آزادی کے بعد مسلسل رسم غلامی کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے پیشروؤں کی طرح ملک کی اعلیٰ ترین درسگاہ سے تعلیم حاصل کی تھی اور خاندانی روایات کے مطابق ہر وہ عیب اپنے اندر پیدا کر لیا تھا جو ایسے دُبیروں کے شایان شان ہوتا ہے۔

ڈاکو اور قاتلوں کو اپنے پاس پناہ دینا.....!

معمولی رنجش پر کسی بھی مخالف کی بہو بیٹی کو اغوا کروا دینا.....!

اپنے علاقے کی بیورو کریسی کو ہر ممکن طریقے سے اپنے کنٹرول میں رکھنا۔ یہ وہ عادات تھیں جو اسے ورثے میں ملی تھیں۔

لیکن.....!

ریاست شاہ نے خود کو انہی روایات کا پابند نہیں رکھا تھا۔ اس نے اپنی خاندانی روایات سے اوپر اٹھ کر ایک نئی جدت بھی اپنائی تھی اور کوشش کر کے اپنا تعلق ڈرگ مافیا سے بھی قائم کر لیا تھا۔

آج اس نے نجمہ ملک کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ نازنین اور اس کی ماں مختار اس بائی کی ملاقات اس سے کروانا چاہتا ہے۔

نجمہ ملک خود کار چلا کر یہاں تک آئی تھی۔ ارسلان نے گھر کے دروازے پر جی جان سے اس کا استقبال کیا۔ جیسے ہی وہ گھر کے مین دروازے سے اندر داخل ہوئی، کیمبرہ حرکت میں آ گیا۔ اندر لان میں نازنین اور مختار اس بائی موجود تھیں جنہوں نے ارسلان سے بڑھ کر جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔

تینوں وہاں لان ہی میں بیٹھ گئیں اور ارسلان نوکر کو ہدایات دینے چلا گیا۔

اس نے اپنی نگرانی میں ان کی بے تکلفی سے گفتگو کی تصاویر بنوائی تھیں اور جب وہ نوکر کے ہمراہ مشروبات لے کر واپس لان میں پہنچا تو احساس فتح سے اس کا چہرہ تہمتار ہا تھا۔ اس نے آج بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔

کافی وقت ان لوگوں نے آپس میں گپ شپ لگاتے گزارا۔ اس درمیان ارسلان کے کہنے کے مطابق نجمہ بیگم نے دونوں ماں بیٹی کو احساس دلادیا تھا کہ وہ دونوں کو کبھی گرم سرد ہوا بھی نہیں لگنے دے گی۔ اس نے اشارے کنایے سے مختار اس اور اس کی بیٹی کو باور کرا دیا تھا کہ وہ بے دھڑک اپنا کام کرتی رہیں اور یہی ارسلان چاہتا تھا۔

فوٹو گرافر نے تین رول مکمل کر لئے تھے جب نجمہ بیگم وہاں سے رخصت ہوئی۔ اسے کوئی زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ کیمبرے میں نصب طاقتور لینز نے اس کا سارا کام بڑی آسانی سے کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ شخص جس نے اسے ہزار روپیہ دے کر اس سے صرف تین رول ایکسپوز کروائے ہیں اس کے کام سے ضرور خوش ہوگا۔ فوٹو گرافر کو قطعاً اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ تین عورتیں کون ہیں نہ ہی اس نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ اسے تو یہ کوئی بڑا ہی بے وقوف نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کام جس کے لئے اس نے ایک ہزار روپیہ دیا تھا یہ تو کوئی بھی شخص مفت کر دیتا۔ یوں بھی اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ کوئی غلط تصاویر نہیں بنائی تھیں۔

لیکن.....!

اس بات کی سمجھا اسے نہ آ سکی کہ آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے؟

مسز ملک کی روائی کے بعد ارسلان نے فوٹو گرافر سے تینوں ایکسپوز فلم رول لے

سکرنری نمایوی کی ضرورت وہ شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ جس بے تکلفی کا مظاہرہ نجمہ ملک نے کیا تھا اس کے بعد جب اسے علم ہوا کہ نجمہ ملک کا ایک سیاسی پس منظر بھی موجود ہے تو ریاست چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ ملک ایسے بوڑھے سیاستدان کو نجمہ ملک نے سیزھی بنا رکھا ہے اور اگر اسے ریاست شاہ جیسا مضبوط سہارا مل جائے تو ملک کی بیساکھیاں اٹھا کر وہ پرے پھینک دے گی۔

دوسری طرف نجمہ ملک نے محسوس کر لیا تھا کہ اب ملک صاحب کی کشتی بھی ڈانواں ڈول ہے۔ وہ بلیک میلنگ کے سامنے جھک کر سرکاری لیگ میں شامل ہوئے تھے اور سرکاری لیگ والوں نے انہیں خوب خوب استعمال کیا تھا۔

چند مہینوں ہی میں ملک صاحب کا شمار صوبائی لیگ کے صف اول کے دشمنوں کی صف میں ہونے لگا تھا جس کے بعد کم از کم ان کا سیاسی مستقبل پہلے جیسا محفوظ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آج اگر مرکزی لیگ کا زور تھا تو سیاست کے اتار چڑھاؤ کا اس ملک میں کسی کو کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ نجانے کل کس بات پر اس کا دھڑن تختہ ہو جائے۔

یوں بھی بلیک میل ہونے کے بعد سے ملک صاحب کی ”بارگیننگ پاور“ کم پڑ گئی تھی۔ نجمہ ملک نے محتاط ترین رائے یہی قائم کی تھی کہ ملک صاحب کا معاملہ اب نفی نفی پر اٹک گیا ہے جب کہ اسے صد فی صد کامیابی چاہئے تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ اس پر ”چھا جانے“ کا جنون سوار تھا۔

اور اس جنون نے اسے ریاست شاہ کے نزدیک کر دیا تھا.....! ادھر ملک صاحب نے نجمہ بیگم کے تیور بھانپ لئے تھے۔ وہ تو دانت دیکھ کر جانور کا اندازہ لگایا کرتے تھے یہ تو کل کی لونڈیا اور اس کے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا تھا۔ بھنڈر کی طلاق یافتہ بیوی نے بڑی تیزی سے سیاسی افق پر نمایاں ہونا شروع کیا تھا۔

یہ خاتون بھنڈر کی رشتہ دار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، لیکن دوسری بیگمات کے برعکس اس نے بھنڈر صاحب کو من مرضی سے روکنا چاہا تھا۔ بھنڈر نے پہلے تو بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن پھر اس خوف سے کہ کہیں اخبارات کو کوئی اور سکیٹنڈل ہاتھ نہ لگ جائے اس نے ایک روز چپ چاپ ذکر

ریاست شاہ رہتا تو شہر میں تھا، لیکن اپنے گاؤں سے اس کی غیر موجودگی میں کوئی اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ کتوں کی دوڑ میں ہمیشہ اس کے کتے پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ اس کے گھوڑے ”ڈربئی“ میں ہمیشہ فیورٹ ہوتے تھے۔ درجنوں ملازم اس کے ان گھوڑوں اور کتوں کی نگرانی اور خدمت کیا کرتے تھے۔

اس شہر میں بہت کم خوش قسمت ایسے تھے جو اس کے کتوں اور گھوڑوں سے زیادہ بہتر زندگی گزارتے ہوں گے۔

نجمہ ملک اور ریاست شاہ کی ملاقات گھوڑوں کی ریس پر ہی ہوئی تھی۔ نجمہ ملک ”ڈربئی“ میں شرکت کرنے آئی تھی۔ یہ ملاقات گو کہ اچانک تھی، لیکن دونوں نے پہلی ہی ملاقات میں اندازہ لگا لیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔ ملاقات نے پھر ملاقاتوں کو جنم دیا۔

ریاست شاہ کو اسمبلی ممبری بھی اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔ انگریز کے دور سے یہ لوگ اسمبلیوں میں بیٹھے چلے آ رہے تھے۔ عورت اور شراب ان کی زندگی کا لازمی جز تھیں۔ نجانے اس کی زندگی میں کتنی عورتیں آئیں اور چلی گئیں۔ ان میں ملک کے بڑے بڑے مقتدر گھرانوں کی وہ شریف زادیاں بھی تھیں جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں اس سے ٹکرائیں اور جسم و جان سے اس کی خدمت کرنے کے بعد جب یہ محسوس کرنے لگتیں کہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھے تو چپ چاپ علیحدگی اختیار کر لیتیں اور فاحشائیں بھی تھیں جنہیں ایک رات میں ایک ایک مہینے جتنا حق الخدمت موصول ہوتا تھا۔

خاندانی شادی تو ریاست شاہ کے بزرگوں نے اس کی کالج کی تعلیم سے فوراً بعد ہی کر دی تھی، لیکن یہ بات وہ بھی جانتے تھے کہ ان کے خاندانوں میں ایسی شادی صرف اتمام حجت کے لئے ہی ہوتی ہے۔

اس کی نیک اور پاکباز بیوی آبائی گھر میں نوکروں کی فوج ظفر موج اور دو بچوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی اور ریاست شاہ شہر میں چھوڑے اڑا رہا تھا۔ یہ چونکہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی اس لئے بے چاری نے اسے اپنا نصیب جان کر قبول کر لیا تھا۔

ریاست شاہ کو جب سے سرکاری مشیر کا درجہ حاصل ہوا تھا اس کے بعد سے ایک

”مجھے ریاست شاہ کے حوالے سے چھپنے والی خبروں پر سخت شرمندگی کا سامنا رہتا ہے۔ میں اب یہ ڈھونگ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ نجمہ بیگم اپنی حیثیت کو مت بھولو۔ میں نے تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھایا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ تم میری پگڑی اخبارات میں اچھالتی پھرو۔“

اس روز جب ایک اخبار نے نجمہ بیگم کے تازہ عشق کی کہانی کو موضوع بنایا تو ملک صاحب کا پیمانہ صبر بالآخر پھلک پڑا۔

”اوہو! بڑا غصہ کرنے لگے ہیں آج کل آپ.....؟ بلڈ پریشر کچھ بڑھ گیا ہے شاید؟“ ملک صاحب میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ مجھے میری حیثیت یاد نہ دلایا کیجئے۔ یہ کام اگر میں نے شروع کر دیا تو آپ کو زیادہ تکلیف پہنچے گی۔“ اس نے سگریٹ کا طویل کش لگا کر ملک صاحب کی طرف دھواں اور طنز اچھال دیئے۔

”ہماری ملی اور ہمیں کو میاؤں۔“ ملک ہونٹ کا تارہ گیا۔

”کچھ بھی کہہ لیجئے ملک صاحب لیکن یہ ضرور یاد رکھئے کہ میں آپ کی زر خرید غلام نہیں ہوں اور نہ ہی آپ اس حیثیت میں ہیں کہ اپنا ہر حکم مجھ پر چلا سکیں۔“ نجمہ بیگم نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”میں اس پاکھنڈ کو ختم کرنے جا رہا ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ اخبارات کا موضوع بنے۔ ممکن ہے تمہارے لئے اپنی عزت کوئی مسئلہ نہ ہو، میرے لئے بہر حال ہے۔“ ملک صاحب نے بالآخر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ بس اس بات کا خیال رہے کہ میرے ساتھ نا انصافی نہیں ہونی چاہئے۔ بہر حال میں اب آپ کی داشتہ نہیں ہوں۔ بیوی ہوں۔ برابر کی حقدار اور شاید آپ نے نکاح نامے میں یہ سب کچھ تحریر بھی کیا ہے۔“ نجمہ بیگم نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ دی۔

”اتر آئی ناں اپنی اوقات پر۔ بے فکر ہو۔ میں تمہارے ساتھ نا انصافی نہیں کروں گا۔ آخر تم نے میری راتوں کو رنگین کیا ہے..... اور میرے لئے یوں بھی پیسے کی کبھی کوئی اہمیت نہیں

بیگم سے علیحدگی اختیار کر لی۔

جب غلامی کا یہ طوق مغربی درسگاہوں کی تعلیم یافتہ ذکیہ بیگم کے گلے سے اترا تو اس نے مکمل کر میدان میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔

سیاست کا آغاز اس نے ایک پریس کانفرنس میں سرکاری پارٹی میں شمولیت کے اعلان سے کیا اور جلد ہی پارٹی کی خواتین ونگ کی آرگنائزنگ سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ گئی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب اسے خواتین کی مخصوص نشستوں پر سینٹ میں بٹھا دیا گیا۔

ذکیہ بیگم ”گن شناس“ عورت تھی۔

وہ انسان کی صلاحیتوں کی بناء پر ہی اس کی قیمت کا اندازہ لگایا کرتی تھی۔ ملک صاحب کو مردہ سیاست میں ایک خلیفہ کا درجہ حاصل تھا اور ایسے لوگ ذکیہ بیگم کی کمزوری ہوا کرتے تھے۔ جب سے ملک صاحب نے سرکاری لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی اس کے بعد سے ذکیہ بیگم کی دلچسپی ان میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

اس نے اندازہ لگایا تھا کہ نوجوان اور انتہائی چالاک کسی چھوٹے گھرانے کی عورت کا یہ بوڑھا خاوند دیر تک اس چڑیا کو اپنے سنہری پنجرے میں بند نہیں رکھ سکے گا۔

ذکیہ بیگم کی جوانی نے بھی پر لگا کر اڑنا شروع کر دیا تھا۔ گوکہ مغرب سے دریا آمدہ سامان آرائش و زیبائش سے اس کے گھر کی الماریاں اٹی پڑی تھیں اور ابھی خاصے عرصے تک وہ اس لیپا پوتی کے سہارے اپنی تیزی سے گزرتی ہوئی جوانی کا بھرم قائم رکھ سکتی تھی۔

لیکن.....!

اب اسے شدت سے ایک خاوند کی ضرورت کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کسی بھی ”ڈمی خاوند“ کی موجودگی میں وہ بہت سی معاشرتی پابندیوں سے مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف ملک صاحب کے لئے ذکیہ بیگم کا روشن سیاسی کیریئر تو باعث دلچسپی تھا ہی، لیکن جھنڈر کی سابقہ بیوی کو اپنا بنا کر وہ اپنے دشمن کے لئے ایک مستقل ذہنی خلیان کا باعث بھی بن سکتے تھے۔

یہی تھیں وہ مشترکہ دلچسپیاں جو دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھیں اور یہ سلسلہ اب خالصتاً ہوتا جا رہا تھا۔

نے تمہاری منکوحہ بیوی بننے پر غور نہیں کیا اس کے علاوہ تو.....“ نجمہ بیگم آنکھ دباتے ہوئے ہنس دی۔

”میں آپ کا احسان مند ہوں نجمہ بیگم۔ لیکن میں نے کبھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر نہیں سوچا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے ساتھ اس حیثیت سے منسلک ہو جاؤں۔ بہر حال آپ کا سماجی رتبہ مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ آپ مجھ پر ایک احسان ضرور فرمائیں۔ اگر ممکن ہو تو وہ تصاویر جو آپ نے نازنین اور ملک صاحب کی تیار کردہ تھیں ان کا ایک سیٹ مجھے بھی عنایت کر دیں۔ میں اس بڑھے کھوسٹ کی بے بسی کا تماشا دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس طرح اس نے مجھے بے بس کر کے مارا ہے اس کے علاوہ نجمہ صاحب مجھے ان تصاویر کے ذریعے نازنین اور اس کی ماں کو بھی قابو میں رکھنا ہوگا..... گو کہ اس کی ضرورت نہیں لیکن آپ تو خود کہا کرتی ہیں کہ انسان کا دماغ گھومنے پر آئے تو ایک پل میں جانے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دے۔ مستقبل میں ہمارے کاروبار کے تحفظ کے لئے ان طوائفوں پر گرفت مضبوط رکھنا ضروری ہے۔ یوں بھی نجمہ بیگم اب آپ ایک معزز اسمبلی ممبر کی بیوی بننے جا رہی ہیں اور ملک صاحب کو بلیک میل کرنا شاید آپ کو زیب نہیں دیتا۔“ ارسلان نے آخری بات کہہ کر اس کے چہرے پر پرامید نظریں گاڑیں۔

”بہت چالاک ہو۔ مکمل کاروباری اور موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے والے۔ اچھی بات ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے بہر حال اس تربیت میں میرا بھی حصہ ہے۔ اب تم مانویا نہ مانو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر میں تمہیں راہ راست پر نہ لاتی تو آج تم ملک کے ایک معمولی کارندے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے جسے وہ جب چاہتا نواز یا اختر کی طرح بلی چڑھا دیتا..... ارسلان! میں حیران ہوتی ہوں یہ سوچ کر کہ میں تمہاری کسی بات کو رد کیوں نہیں کرتی۔ ارسلان! میں اتنی آسانی سے بات مان جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بہر حال مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم میری کمزوری بننے جا رہے ہو۔“

یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی۔

ارسلان خاموشی سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔

”ٹھیک ہے کچھ پرنٹ میں تمہیں بھی دے دوں گی لیکن اس کے ٹیکٹو میرے پاس زیادہ محفوظ رہیں گے، کیونکہ ہم بزنس پارٹنر ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک دوسرے سے تعاون تو کرنا

رہی.....!“ ملک صاحب نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

”آئی رائیٹ! میں منتظر رہوں گی۔“

”میں تمہیں اس وقت طلاق دے دیتا لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہ بات ابھی اخبارات میں نہ آئے۔ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔ اگر تم اسے بھی میری کمزوری سمجھتی ہو تو بے شک اس معاملے کو اخبارات تک بھی لے جانا..... میرا وکیل آج ہی تمہارے ساتھ معاملات طے کر لے گا۔“ یہ کہہ کر ملک صاحب بغیر کچھ سنے باہر نکل گئے۔

سکر ایٹ نجمہ بیگم کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ ایک درخت سے اپنی مرضی کا رس چوسنے کے بعد اب دوسرے درخت کا رخ کرنے جا رہی تھی۔ ریاست شاہ بہر حال اسے زیادہ تحفظ دے سکتا تھا کیونکہ صاحب کے برعکس اس کے ہاں ”خاندانی شرافت“ کا سلسلہ ایک عرصے سے چل رہا تھا اور ملک صاحب اپنے خاندان کے ”پہلے شریف“ تھے۔

”میں نے ملک سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ اس نے ارسلان کے بیٹھتے ہی کہا۔ ارسلان کو مسز ملک نے فون کر کے خاص طور سے یہاں بلایا تھا۔ بہر حال وہ اس کا بزنس پارٹنر تھا جس کو اعتماد میں لینا اس کے لئے ضروری تھا۔ دونوں ایک فائیو سٹار ہوٹل میں بیٹھے تھے۔

”کیا خیال ہے تمہارا؟“ اس نے ارسلان سے پوچھا۔

”آپ کے ہر فیصلے سے مجھے خوشی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کبھی غلط فیصلہ کر رہی نہیں سکتیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت زیادہ بصیرت سے نوازا ہے۔ یوں بھی آپ کا مشن آگے بڑھنا ہے پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں۔ اس لئے جو بات ہو گئی اس پر تبصرہ کیسا؟ البتہ میرے دل میں ایک حسرت باقی رہے گی!“

”کیا.....؟“

”کاش میں ملک صاحب سے اپنی محرومیوں اور مظالم کا بدلہ لے سکتا۔“

ارسلان نے کچھ سوچتے ہوئے ہوا میں تیر چلایا۔

”اس سلسلے میں تم جس طرح چاہو میری مدد حاصل کر سکتے ہو۔ یوں بھی اب ہمارے درمیان کوئی پردہ تو رہ نہیں گیا، چونکہ تم مجھے بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کرو گے اس لئے شاید میں

کہ اس کے بعد بھی ملک صاحب کو دماغ کی خرابی کا دورہ پڑے گا۔“
 ”شاباش..... لیکن محتاط رہنا اور ہاں خود کو اکیلا کبھی نہ سمجھنا۔ تم کوئی ایسی ویسی مچھلی نہیں
 ہو جسے ملک اتنی آسانی سے نگل سکے۔“

نجمہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نجمہ بیگم اب آپ میرے اور ملک کے درمیان سے ہٹ گئی ہیں۔ اب آپ دیکھیں
 گی کہ میں ملک صاحب کو کس طرح تنگی کا ناچ نچاؤں گا..... بیگم صاحبہ جن لوگوں نے مجھ سے میرا
 گھر اور میری شناخت چھینی ہے، میں ان کو نیست و نابود کر کے رکھ دوں گا۔ اس کے علاوہ میری
 زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں رہ گیا۔“

ارسلان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی آخری بات پر ایک لمحے کے لئے نجمہ بیگم چونکی ضرور تھی۔

لیکن.....!

پھر اس نے اس خیال ہی کو اپنے دل سے نکال دیا کہ یہ کل کالونڈا کبھی اس کے لئے بھی
 کوئی خطرہ پیدا کرے گا؟



ہی ہوگا۔“

”میں آپ کے اس احسان کا بدلہ ساری عمر نہیں چکا سکتا۔ آپ میرے تصورات سے
 بڑھ کر عظیم عورت ہیں۔“

”بس بس.....“ نجمہ بیگم نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات ٹوک دی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔ تم میری تعریف نہ بھی کرو تو میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔
 ارسلان مجھے علم نہیں تمہاری میری متعلق کیا رائے ہے لیکن اگر تم یقین کر سکتے ہو تو کر لو کہ میں نے
 ازدواجی زندگی کے دوران جس نوعیت کے تعلقات تمہارے ساتھ قائم کئے ہیں کسی اور کے ساتھ
 نہیں کئے..... اور ہاں مجھے ابھی کچھ زیادہ جلدی بھی نہیں ہے۔ میں شادی اب سوچ سمجھ کر ہی
 کروں گی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ریاست شاہ کی خواہش ہے کہ ہم جلد از جلد رشتہ
 ازدواج میں منسلک ہو جائیں لیکن میں الیکشن کے بعد ہی کچھ کر سکوں گی۔ ابھی میرے خیال سے
 مجھے ساری توجہ بزنس اور سوشل ویلفیئر پر ہی دینی چاہئے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”میں آپ کی اس بات سے صد فی صد اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی ابھی آپ کو جلد بازی
 سے کام نہیں لینا چاہئے۔ پھر نجمہ بیگم یہ بھی تو معلوم نہیں کہ ریاست شاہ سے شادی کے بعد ہمارے
 تعلقات کی نوعیت کیا ہو جائے گی کیونکہ ملک صاحب کی بات تو اور تھی وہ تو.....“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ میرا درد سر ہے۔“ اس نے ارسلان کی بات سمجھ کر کاٹتے
 ہوئے کہا۔

دونوں دوپہر تک وہیں رہے۔ مسز ملک نے اسے جاتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ جس کوشی
 میں رہائش پذیر ہے وہ ملک صاحب نے اس کے نام لگا رکھی ہے اور نجمہ بیگم اپنی رہائش اب وہیں
 رکھے گی۔ اس نے اپنے ایک بھائی، بہن اور ماں کو بھی یہیں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح وہ کم از
 کم ”فیملی لائف“ کا تاثر قائم رکھ سکتی تھی۔ ورنہ تو اخبار والے اس کے وہ لیتے لیتے کہ خدا کی پناہ!
 اب اسے بہت محتاط ہو کر زندگی گزارنا تھی۔

اس نے ارسلان کو بتا دیا تھا کہ ملک ارسلان کے لئے مسائل پیدا کرے گا کیونکہ وہ کم
 از کم ارسلان کا نجمہ بیگم کے ساتھ رہنا برداشت نہیں کر سکتا۔

”اس خطرے کی پیش بندی کے لئے ہی تو آپ سے تصاویر مانگی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا

ضرورت ہی نہ رہ جاتی۔

اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے اس نے پہلے ہی سے تین چار خیراتی قسم کے ادارے کھول رکھے تھے جہاں وہ بیوہ اور بے سہارا خواتین سے دستکاری کروا کر یہاں کا تیار شدہ مال پھر بازار میں اچھے داموں فروخت کروا دیا کرتی تھی۔ ان اداروں کے نام پر اچھی خاصی گرانٹ اسے سرکاری طور پر الگ سے مل جایا کرتی تھی۔

اپنی دانست میں تو دونوں نے خاصی احتیاط برتی تھی لیکن اس کے اندازوں کے بالکل برعکس ملک صاحب کی لندن موجودگی کے دوران ہی یہ راز طشت از باہم ہو گیا۔ جس کے بعد سے اخبارات نے اس کو موضوع بنالیا۔ جس روز ملک صاحب لندن سے لوٹے تو ہوائی اڈے پر ہی اخبار نویسوں نے انہیں گھیر لیا۔ ملک صاحب کا بادل خواستہ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ ان کے اور نجمہ بیگم کے درمیان خاموشی سے علیحدگی ہو چکی ہے اور دونوں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ انہوں نے اخبار نویسوں سے اپیل کی تھی کہ ان کی ذاتی زندگی کو اخبارات میں نہ اچھالا جائے۔

اسی نوعیت کا بیان نجمہ بیگم نے اخبارات کو جاری کیا تھا جب ایک تقریب میں ایک اخبار نویس نے ریاست علی کے حوالے سے کچھ بات کہنا چاہی تو نجمہ ملک نے اسے بری طرح ڈانٹا کہ بے چارہ ہکا بکا ہی رہ گیا۔ اس کے بعد کسی نے اس نوعیت کا کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔ کلرک بادشاہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ جینڈر کی قسمت نے پلٹا کھایا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے پارٹی میں اپنی دھاک بٹھائی تھی لیکن سرمنڈواتے ہی اولے پڑ گئے اور ملک نے ایک ہی داؤ میں اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

اس روز جب صوبائی لیگ کو اپنے ”اندرون خانہ ذرائع“ سے اطلاع ملی کہ اگلے 48 گھنٹوں کے اندر اندر مرکزی لیگ کی طرف سے الیکشن کے انعقاد کا اعلان ہونے والا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ابھی تک یہ لوگ کوئی ڈرامہ حکومت کے خلاف ایسا تیار نہیں کر سکے تھے کہ جس سے اپنی گرتی ساکھ کو سنبھالا دے سکیں۔

فی الوقت تو ملکی فضا ان کے خلاف تھی اور کلرک بادشاہ کی اس پریس کانفرنس کو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ میں ایک سازش کے تحت کچھ زیادہ ہی اچھالا جا رہا تھا۔

حملہ

نجمہ اور ملک نے بڑی ہوشیاری سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ملک صاحب چندرہ روز کے لئے ”علاج کروانے لندن“ چلے گئے تھے اور جس کوٹھی میں وہ مقیم تھے وہ انہوں نے خالی کر دی تھی۔ نجمہ کی ہدایت پر ابھی تک ریاست شاہ نے زیادہ گرجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یوں بھی وہ پرانا شکاری تھا اور شکار کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ مار کھانے کا قائل!

نجمہ بیگم نے اپنے گھر والوں کو اپنی دولت کے بل بوتے پر خاصا معزز بنا دیا تھا۔ اس کے خاندان میں شاید اس کے وہ دو تین بہن بھائی ہی ایسے تھے جنہوں نے اتنے اعلیٰ اور مہنگے سکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان لوگوں کے نجمہ بیگم نے بہت عرصہ پہلے جب وہ ملک صاحب کی بیوی بنی تھی اس شہر کے ماڈرن آبادی میں ایک فلیٹ کرائے پر لے دیا تھا جہاں وہ اپنی ذات بدل کر اپنے ناموں کے آگے پیچھے نئے ناموں کا اضافہ کرنے کے بعد بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

پیش آمدہ حالات کی پیش بندی کرنے کی خاطر اس نے ساری منڈلی اب اپنے ہاں جمالی تھی۔ اس کا گھرا تباہ تھا کہ ایسے دو چار اور خاندان بھی اس میں سما سکتے تھے۔ جو کاروبار اس نے سنبھال رکھا تھا۔ اس میں اتنی زیادہ آمدن ہو جاتی تھی کہ جس کے بعد اسے کسی اور سہارے کی

”کیا بکواس ہے؟ یہ کون سے لوگ آپ نے اکٹھے کر لئے ہیں یہاں؟ میں صدر صاحب آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“ میاں کو طیش آ گیا۔

”سٹ ڈاؤن..... اپنی اوقات میں رہو۔ تم ہو کیا؟“ سیکرٹری کے ایک ساتھی کی غیرت جاگی۔

اس کے ساتھ ہی بھنڈراٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”صدر صاحب یہاں غنڈہ گردی کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ اس ”بھان متی کے کنبے“ نے کیا پلان تیار کیا ہے۔ خدا را! انہیں سمجھائیے زیادہ تماشائے لگائیں۔ جتنی اس کی عمر ہے اس سے زیادہ وقت میں نے سیاست میں گزارا ہے۔“

”آپ نے جھک ماری ہے.....!“ بھٹی صاحب کو بھی جوش آ گیا۔ ”اس نے سوائے غنڈہ گردی کی سیاست کے اور کیا ہی کیا ہے؟“

”چپ کر اوائے شرافت کے مامے.....!“ اب سیال صاحب کی باری تھی۔

”تیری یہ ہمت.....!“

کہتے ہوئے وہ سیال صاحب کی طرف لپکے۔ اس سے پہلے کہ صدر صاحب اور دوسرے ممبران حالات کو سنجالیں، دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں مچھلی بازار لگ گیا۔ ہر کوئی حسب توفیق دوسرے کو صلواتیں اور گالیاں سنارہا تھا۔

”جھڑت بیٹھ جائیے..... بیٹھ جائیے..... بیٹھ جائیے۔“ صدر صاحب مسلسل اپیلیں کر رہے تھے لیکن کوئی ان کی اپیل پر کان دھرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے جوتیوں میں دال بٹنے لگی اور صدر صاحب کو بادل خواستہ سہ پہر تک اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔

پارٹی ممبران نے ہاتھ پائی تو نہ ہونے دی لیکن اس میں کسر بھی نہیں رہ گئی تھی۔ اس وقت تو ان لوگوں کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ کانفرنس ہال کے باہر موجود انقلابی سٹوڈنٹس گجر گروپ کے کارکن جنرل سیکرٹری صاحب کے خلاف نعرے لگاتے اندر گھس آئے۔ انہوں نے بھنڈر صاحب کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور ان کے حق میں نعرے بازی شروع کر دی۔

اس سے بہتر فضا قدرتی طور پر مخالفین کو پھر کب میسر آ سکتی تھی۔ صوبائی لیگ کے کرتا دھرتا جانتے تھے کہ اگر ان حالات میں الیکشن کا اعلان کر دیا گیا تو وہ شاید ایک صوبے میں بھی اپنی حکومت برقرار نہ رکھ سکیں حالانکہ اس سے پہلے ان لوگوں نے دن رات محنت کر کے عوام میں خاصی جگہ بنالی تھی۔

”بھنڈر صاحب برا مت مانیں۔ آپ نے ہمارے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ دن رات محنت کر کے ہم نے عوام کے دلوں میں جگہ بنائی تھی اور حالات کو اپنے حق میں استوار کیا تھا لیکن آپ نے ملک صاحب کی دشمنی میں اندھے ہو کر ہمیں اپنے بہترین دماغ سے محروم کر دیا۔ جی ہاں! برا مت مانئے بھنڈر صاحب صرف آپ کی وجہ سے ملک صاحب نے پارٹی سے علیحدگی اختیار کی ہے اور آپ نے آج تک سوائے بڑے بڑے دعوؤں کے اور کچھ نہیں کیا۔“

جنرل سیکرٹری تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر بھنڈر پر برس پڑا۔

وہ لوگ 24 گھنٹے کے نوٹس پر ملک کے کونے کونے سے آج یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔

بھنڈر جانتا تھا کہ یہ جنرل سیکرٹری کبھی اس کا ہمدرد نہیں رہا اور ملک کے بہترین ساتھیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

”سیکرٹری صاحب! کم از کم پارلیمانی آداب کا خیال تو رکھئے۔ آپ ایک سینئر ممبر سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کو کسی بھی پارٹی ممبر کو ڈانٹنے کا حق کس نے دیا ہے.....؟“

بھنڈر کے اشارے پر اس کے ایک ساتھی نے کھڑے ہو کر ہنگامے کا آغاز کرنا چاہا۔

اس نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ آج کے اجلاس میں سب کی تان اس پر ہی ٹوٹے گی۔ خصوصاً ملک کے پرانے دوست جن میں پارٹی سیکرٹری سرفہرست تھا، اس کو خوب رگڑیں گے۔

”آپ بیٹھ جائیں میاں صاحب اور میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں.....!“ سیکرٹری کو بھی غصہ آ گیا۔

”کیا مطلب؟ آپ کو شرم آئی چاہئے۔ آپ مجھے.....؟“

”بیٹھ جاوئے چچے۔“ میاں صاحب کی بات نامکمل تھی جب عقب سے آواز بلند ہوئی۔

”اوئے بیٹھ جاوئے۔ کوئی سوال نہیں ہوگا۔ سمجھ آئی۔“ صدر صاحب کی بغل میں کھڑے ایک ”انقلابی گارڈ“ نے اسے ڈانٹ کر بٹھا دیا۔

”حضرات باقی باتیں چائے پر.....“ کہہ کر صدر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

اخبار نویس ندیدے بچوں کی طرح چائے اور دیگر لوازمات پر ٹوٹ پڑے۔

اس درمیان تمام اخبار نویسوں کی حسب مراتب اور حسب معمول جیسیں گرم ہو چکی تھیں۔

لیکن.....!

صوبائی لیگ کے لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اگلے روز ملک کے قریباً ہر قابل ذکر اخبار نے اس ہنگامے کی خبر شدہ سرخیوں سے شائع کی تھی اور اپنے تبصرے بھی شائع کئے تھے۔ یہ تمام اخبارات کم از کم اس بات پر متفق تھے کہ صوبائی لیگ میں موجود ایک خاص گروپ کی غنڈہ گردی کی وجہ سے اچھے لوگ اس سے علیحدگی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

ان اخبارات نے اگلے انتخابات میں صوبائی لیگ کی کامیابیوں کے دعوؤں کو باطل گردانا تھا اور یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ اپنے دعوؤں کے برعکس صوبائی لیگ شاید ایک صوبے میں بھی اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکے۔

○

نجمہ بیگم نے اگلے ہی روز ملک صاحب کی تصاویر ارسلان تک پہنچا دی تھیں۔ جس کا اس نے ضرورت سے زیادہ ”گرم جوشی“ سے شکریہ ادا کیا تھا۔ یہ بات اب اس کے لئے حیران کن نہیں رہی تھی کہ نجمہ بیگم نے اس کی کسی غیر اخلاقی حرکت کا برا ماننا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن.....!

اس نے بھی کبھی اپنی حد سے تجاوز نہیں کیا تھا۔

”سپانسر شپ آگئی ہے اور دونوں ماں بیٹی بھی لندن کی سیر کے لئے اتاوا ہوئی جاتی ہیں۔ بس آپ کے حکم کا انتظار ہے.....!“ ارسلان نے اس مرتبہ کھیل کا ڈراپ سین کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔

”اس میں حکم کی کیا بات ہے جناب۔ ہم برابر کے پارٹنر ہیں۔ بس ذرا سجاوٹ خان

اس کے ساتھ ہی کسی نے کرسی اٹھا کر بھنڈر صاحب کی طرف اچھالی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ آپس میں گھم گھما ہو گئے۔ اخبار نویس بھی اس سنہرے موقعے کی تلاش میں تھے۔ کیمرہ کی فلیش گتیں چمکیں اور یہ مناظر سلائیڈ کے فیتوں میں منتقل ہو گئے۔

پندرہ بیس منٹ تک کانفرنس ہال میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ جب معاملہ کسی طرح ٹھنڈا پڑتا نظر نہ آیا تو پارٹی سیکرٹری نے دل پر پتھر رکھ کر پولیس کو مداخلت کا حکم دے دیا۔

پولیس والے بھی جانے کب سے تاؤ کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے لڑکوں کی وہ درگت بنائی کہ خدا کی پناہ! اس منٹ کے اندر اندر ہنگامہ فرو ہو گیا۔

جب اخبار نویس اپنے دفاتر کی طرف بھاگنے کے لئے اپنی موٹر سائیکلیں اشارت کر رہے تھے تو عین ان لمحات میں صوبائی لیگ کے کچھ ممبران نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر لفافے ان کی جیسوں میں منتقل کئے اور انہیں ہنگامی پریس کانفرنس کے لئے روک لیا۔

یہ پریس کانفرنس پارٹی کے صدر صاحب کی طرف سے پارٹی کے سنٹرل آفس میں کی گئی تھی۔ ایک گھنٹے کے نوٹس پر بلائی گئی اس پریس کانفرنس میں سیکورٹی کے انتظامات اتنے سخت تھے کہ کسی چڑیا کے بھی یہاں پر مارنے کی گنجائش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ انقلابی سنوڈنٹس کے گجبر کے مخالف ونگ کے طلباء نے گارڈ کے فرائض سنبھال رکھے تھے اور وہ صرف اس پارٹی ممبر کو اندر جانے کی اجازت دیتے تھے جسے سیکرٹری یا صدر صاحب کی کلیرنس ملتی تھی۔

صدر صاحب نے اخبار نویسوں میں ایک لکھا ہوا بیان تقسیم کر دیا جس میں بتایا گیا تھا کہ مرکزی لیگ کے پروردہ غنڈہ عناصر نے خوب خوب حق نمک ادا کیا ہے اور ایک سازش کے تحت ہنگامہ کھڑا کیا گیا جس میں پارٹی کا کوئی ممبر ملوث نہیں۔ یہ سازا کار نامہ مرکزی لیگ اور ان..... سرکاری ایجنسیوں کا ہے جو مرکزی لیگ کو آئندہ انتخابات میں کامیاب کروانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ بیان میں اس صورت حال کو انتہائی افسوس ناک قرار دیتے ہوئے اس کی ساری ذمہ داری مخالفین پر ڈال کر صدر صاحب نے وارننگ دی تھی کہ مرکزی لیگ نے سیاست میں تشدد اور غنڈہ گردی کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے وہ جمہوریت کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔“

”جناب والا.....“ ایک اخبار نویس نے کھڑے ہو کر سوال کرنا چاہا۔

سے خوفزدہ رہے جب کہ وہ خود ملک پر باد رکھنا چاہتی تھی۔
لیکن.....!

ارسلان کی خواہش پر اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔ اس نے نجمہ بیگم سے درخواست کی تھی کہ وہ کچھ عرصے کے لئے سوشل تقاریب میں اسے بطور سیکرٹری اپنے ساتھ لے جانا چھوڑ دے۔ اس درمیان ملک کے شر سے محفوظ رہنے اور سانپ کا زہر نکالنے کا کوئی بندوبست بھی کرے گا۔

○

یہاں سے رخصت ہو کر اس نے سجاد خان کو فون کیا تھا، لیکن وہ ملک سے باہر تھا۔ ارسلان کی خواہش پھر اس کا پیغام ”فوری رابطے“ کے لئے سجاد خان کو پہنچا دیا گیا تھا اور دوپہر کے بعد اسے سجاد خان کے ایک دفتر میں پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

اس دفتر میں وہ دو تین مرتبہ پہلے بھی جا چکا تھا اور یہاں کا سٹاف بھی اسے پہچاننے لگا تھا۔ دفتر کی مقامی انچارج نے اس کی رہنمائی ایک فون تک کی جہاں اس کے بیٹھنے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی سجاد خان کی غیر ملک سے کال موصول ہو گئی۔

اس نے سجاد خان کو فون پر نجمہ بیگم کی تازہ واردات سے جودہ کرنے جاری تھی آگاہ کیا اور اب اس کی اجازت کا منتظر تھا۔

”اگر آپ کا حکم ہو تو یہ کھیل اب ختم کر دیا جائے؟“

”ہاں اب اس کھیل کو ختم ہونا ہی چاہئے.....!“ سجاد خان کی گھمبیر آواز فون پر ابھری۔ اس نے ارسلان سے دو نمبر نوٹ کرنے کے لئے کہا تھا۔ ایک ٹیلی فون نمبر مقامی تھا اور ایک لندن کا۔

”فلائٹ کی روانگی کے بعد پہلے لندن والے فون پر پھر مقامی فون پر رپورٹ کر دینا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس زہریلی ناگن کو کس طرح جال میں پھانتے ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ صرف دو طوائفوں کی گرفتاری تک معاملہ محدود نہیں رہنا چاہئے..... اس طرح تو ان بے چاروں سے خواہ مخواہ زیادتی ہو جائے گی۔“

”خان صاحب! آپ مطمئن رہیں۔ میں نے بھی بہت کچھ سیکھا ہے نجمہ بیگم سے اور

سے.....“

”نجمہ بیگم آپ نے نجانے کیوں اسے اپنے ذہن پر مسلط کر رکھا ہے۔ بھی اس ملک میں کتنے لوگ اس دھندے سے وابستہ ہیں۔ کیا وہ پہلے سجاد خان سے سرٹیفکیٹ لے کر ہی اپنا کام شروع کرتے ہیں..... اگر میں نے پہلے چکر ہی میں باہر منڈی اور گاہک تلاش کر لیا تھا تو سجاد خان کے مشورے سے نہیں کیا تھا..... برائے مہربانی آئندہ آپ یہ نام استعمال نہ کیا کریں۔ مجھے تو اب اس شخص سے خواہ مخواہ کی رقابت محسوس ہونے لگی ہے حالانکہ ریاست شاہ سے ہونی چاہئے۔“

آخری فقرے پر نجمہ بیگم نے تہقہ لگا کر اس کے گال پر چٹکی لی تھی۔

”اب تم بھی ایسا سوچتے ہو.....!“ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”پرسوں شو کے سے دونوں تیار بیک وصول کر لینا۔ اس مرتبہ انہیں دوسرے ایئر پورٹ سے بھیجتا ہے۔ میں خود نہیں جاؤں گی، لیکن وہاں اپنا آدمی موجود ہے اور ہاں اس مرتبہ مال ذرا ڈبل کر کے بھیجتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کامیاب چکر کے بعد ریاست علی سے شادی کر لون جس کے بعد لمبے عرصے تک خاموشی اختیار کرنا ہے کیونکہ ریاست شاہ کو اعتماد میں لیتے ہوئے دیر لگے گی۔ میں جانتی ہوں تم جو کہنا چاہتے ہو اس بات کا مجھے بھی علم ہے کہ وہ یہ کام ایک عرصے سے چلا رہا ہے لیکن اس چیز کا خیال رہے کہ اسے ابھی اس بات کا علم نہیں ہوا کہ میں یہ دھندہ کر رہی ہوں۔ حالانکہ وہ ماضی میں میرے اور سجاد خان کے تعلقات سے باخبر ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایسے سوشل تعلقات سیاست میں زندہ رہنے کے لئے ناگزیر ہیں اور ان پر قدغن بھی نہیں لگائی جاسکتی۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ کا حکم۔ نوکر کیا اور خیرہ کیا؟“ ارسلان نے حسب خواہش حرکت کی تھی۔

دونوں کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر الگ الگ ہوٹل سے رخصت ہو گئے۔

ملک صاحب سے طلاق لینے کے بعد نجمہ اور ارسلان نے اپنی ملاقاتوں میں خاصی احتیاط برتنا شروع کر دی تھی۔ اس احتیاط کا زیادہ مظاہرہ ارسلان کی طرف سے ہوتا تھا، حالانکہ نجمہ بیگم کو اس سے الجھن ہوتی تھی اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ارسلان اب ملک سے کسی وجہ

اس ملک کے ہر کوئے میں بڑے بڑے بد معاش اور رسہ گیر اس کے دسترخوان پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ ملک نے کسی کو مروا چاہا اور وہ بچ نکلا ہو۔

نجانے کتنے بے گناہوں کا خون تھا اس کی گردن پر.....؟

نجانے کتنی گناہوں کا خون تھا اس کا شیطانی ذہن کا فرما تھا.....؟

نجانے کتنی بیواؤں کی بددعاؤں اس کا تعاقب کر رہی تھیں.....؟

نجانے کتنی ماؤں کے کلیجے میں انگارے اتارے تھے اس نے.....؟

”ملک صاحب میں آپ کے لئے خدا کا عذاب بننے والا ہوں.....!“ اس نے زیر

لب دہرایا۔

اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چپکنے لگے تھے۔ ماتھے کا پسینہ اس نے قمیض کی آستین سے پونچھا۔

”میں ان شیطانوں کو آپس میں ٹکرا کر تھس نہں کر دوں گا۔ زمین تمہارے بوجھ سے

آزاد ہو جائے گی۔ شیطانو! بے ایمانی اور بد معاشی کا جو ہر تم نے قوم کی رگوں میں اتارا ہے وہ

تمہارے ہی لئے سم قاتل بنے گا۔“

جانے کتنے نوجوانوں کو تم نے درندہ بنا ڈالا۔ اب یہ درندے تمہاری رگوں سے خون

چوس لیں گے۔

تم مر جاؤ گے۔

تمہیں مرنا ہوگا.....!

اس ملک کے ہر دشمن کو مرنا ہوگا خواہ اس نے کوئی بھی لبادہ اوڑھ رکھا ہو۔ کوئی بھی

روپ دھار رکھا ہو۔

ملک! میں ابتدا کرنے جا رہا ہوں۔ پہلا پتھر میں ماروں گا۔ پہلی گولی میں فائر کروں گا

تم سب کے لئے تم فرعونوں کے لئے۔ رسم موسوی کی ابتدا مجھ سے ہوگی۔ وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا

اور پاگلوں کی طرح دیواروں سے باتیں کر کے قہقہے لگاتا رہا۔

تصویرات کے اس جہنم سے اسے ٹیلی فون کی گھنٹی نے نجات دلائی۔ فون پر پراپرٹی ڈیلر

اس سے مخاطب تھا۔

اس کی تربیت ہی کو اب اس کے خلاف استعمال کرنے جا رہا ہوں۔ آپ کے لئے چونکا دینے والی خبر بھی موجود ہے کہ ان لوگوں کی گرفتاری کے ساتھ ہی نجمہ بیگم کے ”گینگ لیڈر“ ہونے کے بیانات ماں بیٹی کی طرف سے دیئے جائیں گے اور اس کا دستاویزی ثبوت ذمہ داروں تک پہنچ جائے گا۔“

”وہ ڈر فل.....! خالصے سمجھا رہو نوجوان۔ خاصے کام کے آدمی لگتے ہو گڈ لک..... خدا حافظ!“

دفتر سے باہر آ کر اس نے دوبارہ پیش آمدہ واقعات کی ترتیب کو ذہن میں دہرایا اور کاغذ کا وہ پرزہ احتیاط سے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا۔ سجاد خان نہیں جانتا تھا کہ ارسلان نے ایسے تین چار نمبر ملکی اور غیر ملکی پہلے ہی سے حاصل کر رکھے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دونوں اس ملک میں گرفتار ہوں۔ دونوں کو وہ غیر ملک میں گرفتار کروانا چاہتا تھا تاکہ نجمہ بیگم کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کا موقعہ ہی نہ مل سکے۔

اسے ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر بڑی احتیاط سے اٹھانا تھا۔

سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے جا رہا تھا وہ.....!

ایک ہی وقت میں اس نے نجمہ بیگم ریاست علی اور ملک صاحب کو لاکاڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ اپنے مفادات پر فوراً شیطانی ٹولے کا روپ اختیار کر لیتے ہیں نجمہ بیگم بہر حال کچھ عرصہ پہلے تک ملک صاحب کی بیوی تھی اور طوائفوں کے بیانات میں یہ سب کچھ بتایا جائے گا۔ یہ بھی بتایا جائے گا کہ وہ ملک صاحب کے بستر کی زینت بھی بنتی رہی ہے۔

ملک تمللا اٹھے گا۔

اس کا تعلق اخبارات فوراً اس گروہ سے جوڑ دیں گے اور اس کا سیاسی کیرئیر تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

بھنڈر کے لئے خیر ”نرمپ کارڈ“ بن جائے گی۔ وہ ساری دنیا کے پریس کو سر پر اٹھا

لے گا اور ارسلان جانتا تھا کہ ملک صاحب اس ملک کے تمام شکاری کتوں کو اس کے پیچھے لگا دیں

گے۔ اسے زمین کی ساتویں تہہ سے نکال کر مروا ڈالیں گے۔

اس نے اپنی جوانی کے قیمتی سال ملک کے ساتھ بھیٹ چڑھائے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ

دیکھے..... اور ہاں! ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر کہیں تمہارے منہ سے میرا ذکر نکل گیا تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ انگریز لوگ کسی تیسرے آدمی کی اپنے معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتے۔ تمہارے وہاں پہنچنے سے اگلے ہی دن میں وہاں آ جاؤں گا۔ اس مرتبہ تمہیں جرمن اور ہالینڈ کی سیر بھی کروانی ہے اور اگلی مرتبہ امریکہ.....“

اس کی چرب زبانی کے سامنے مختاراں بیگم کی ایک نہیں چلتی تھی۔ بس ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ہوس نے اسے اس بری طرح اندھا کر دیا تھا کہ اب اسے سادوں کے اندھے کی طرح صرف ہریالی ہی دکھائی دیتی تھی اور کچھ نہیں۔

اس مرتبہ واقعی انہوں نے دوسرا ایئر پورٹ استعمال کیا تھا۔ اس شہر تک ارسلان انہیں خود چھوڑنے گیا تھا۔ اس نے لالچ کی ماری ماں اور ہوس کی اندھی نازنین کو یہ باور کروا دیا تھا کہ کوئی بھی مشکل پیش آنے پر وہ فوراً نجمہ بیگم کا نام لے دیں۔ اس کا ایڈریس اور فون نمبر انہوں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

دونوں نجمہ بیگم کی قائل کیوں نہ ہوتیں۔ اپنے ملک سے پرواز کے وقت ارسلان انہیں جہاز تک چھوڑنے آیا تھا جب کہ عام حالات میں یہاں لوگ ایئر پورٹ کی چار دیواری کے اندر بھی داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

جہاز اڑا تو دونوں کا دماغ بھی اس کے ساتھ ہی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ اس مرتبہ ان کے لئے ایکڑ کینٹون میں سیٹیں لی گئی تھیں۔ غیر ملکی ایئر ہوسٹس ان کے سامنے کینروں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔

”گٹ وگ“ ایئر پورٹ پر جہاز نے لینڈ کیا تو خوشی سے دونوں کا چہرہ دکھنے لگا۔ اس ایئر پورٹ پر وہ پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ اس سے پہلے جہاز بمبھرو ایئر پورٹ پر اترتا تھا۔ زمین پر ان کے قدم نہیں نکلتے تھے۔ بوئے نازخرے سے ماں بیٹی امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچتی تھیں جہاں برطانوی پولیس ویدہ دول فرش راہ کئے ان کی منتظر تھی۔

امیگریشن کاؤنٹر سے انہیں اندر نہیں آنے دیا۔ کاؤنٹر سے ”بیج“ تک خفیہ پولیس کی دو عورتیں محکمہ صحت کے ملازمین کے روپ میں ان سے چپکی صرف اس بات کا جائزہ لیتی رہیں کہ

”ارسلان صاحب بہت خوش قسمت ہیں آپ۔ بڑا زبردست گاہک ملا ہے۔ کوئی بہت ضرورت مند ہے بے چارہ۔ شاید باہر کے ملک سے کمائی کر کے لوٹا ہے۔“

”لوٹ لو۔ لوٹ لو شیخ صاحب جانے نہ دینا۔ کسی کوچ کر نہ جانے دینا۔“ وہ شاید ابھی تک اسی ترنگ میں بولے جا رہا تھا اور دوسری طرف پراپرٹی ڈیلر شیخ بے شری سے دانت نکال رہا تھا۔

اگلے 48 گھنٹوں میں اس کے شاندار بنگلے کا سودا چپ چاپ ہو گیا تھا۔ ابھی اس نے ایک ماہ تک اسی بنگلے میں قیام کی قانونی اجازت حاصل کر لی تھی۔

ارسلان کو کسی ایسی ہی پارٹی کی تلاش تھی جو پراپرٹی کی قیمت اس کو کسی دوسرے ملک میں ادا کرے۔ اس نے ساری قیمت غیر ملکی کرنسی میں اپنے غیر ملکی اکاؤنٹ میں جمع کروا لی تھی۔

بظاہر اس کی تمام تیاریاں مکمل تھیں.....!

فرار کے سارے راستے کھلے تھے.....!

اور اب وہ حملہ کرنے جا رہا تھا.....!

○

شو کے نے حسب معمول کمال فن کا مظاہرہ کیا تھا اور دوا ایسے بیگ تیار کر لئے تھے جن کو ٹٹولنے پر بھی ان میں سے کچھ برآمد نہ ہوتا۔

”بھلا کوئی ان پر شک کر سکتا ہے.....!“ ارسلان نے دونوں بیگ مختاراں کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”واقعی ارسلان باؤ کمال ہے ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ اس میں کیا ہے اور کہاں رکھا ہے؟“

مختاراں نے بیگوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہیں جاننے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس تم یہی سمجھو کہ جیسے یہ تمہیں نظر آ رہے ہیں ویسے ہی ہیں..... پھر بی بی! فکر کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تم نجمہ بیگم کا کام کر رہی ہو۔ وہ جتنی یہاں بااثر ہے اس سے کئی گنا زیادہ اس کا اس ملک میں اثر ہے۔ کسی بات سے گھبرانا نہیں۔ کوئی بھی بات ہو دھڑلے سے نجمہ بیگم کا نام لے دینا..... کس کی مجال ہے جو تمہاری طرف نظر اٹھا کر بھی

پارٹ آف گیم

”بیٹی گھبراؤ نہیں۔ بھلا کبھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ مسز ملک کے حکم سے سرتابی کریں۔ انگریزوں کا ملک ہے ناں اس لئے ذرا ڈرامہ تو کریں گے۔ شاید کھلے عام بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔“ مختار اں نے پولیس کار میں بیٹھی اپنی بیٹی کو تسلی دینے کے لئے یہ بات تو کہہ دی تھی لیکن اس کا دل خزاں زدہ بچے کی طرح لرزاں تھا۔ جس قیامت سے وہ گزر رہی تھی اس کا تو تصور ہی کبھی اس نے نہیں کیا تھا۔

”اور ہاں ذرا ہوشیاری سے، نجمہ کے علاوہ کوئی اور نام نہ لینا ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

مختار اں نہیں جانتی تھی کہ اس کی تمام حرکات کو مانیٹر کیا جا رہا ہے۔ اس کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔

دونوں کو وہ لوگ جس پولیس سٹیشن لائے تھے وہ اپنے ملک کے دفتر جیسا ہی لگتا تھا۔ یہاں چاروں طرف میزوں، ٹیلی فونوں اور کمپیوٹرز کا جال بچھا تھا۔

”دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ بھلا یہ تھانہ ہو سکتا ہے۔ تھانے بھلا ایسے ہوتے ہیں۔“ اس نے دوبارہ جھوٹ بول کر نازنین کو بہلانا چاہا۔

راستے میں کن لوگوں سے سلام دعا لیتی ہیں۔

دوران پرواز جہاز میں نازنین پر ریشہ خطنی ہونے والے دونوں جوانوں کو بھی بڑے سخت مراحل سے گزرنا پڑا۔

ماں بیٹی نے بیگ ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔ پھر اپنا واحد اٹچی کیس انہوں نے ”ریوالونگ پیلٹ“ سے وصول کیا اور دوسروں کی دیکھا دیکھی گرین چینل پر چلنا شروع کر دیا۔

ابھی بمشکل چند گز ہی چلے پائی تھیں کہ انہیں ایک کسٹمر آفیسر خاتون نے روک کر ان کی تلاشی لینے کی استدعا کی۔ ماں بیٹی کا رنگ ایک لمحے کے لئے فق ہوا لیکن پھر وہ سنبھل گئیں۔

دونوں کو ایک کہین میں لے جایا گیا جہاں ان کی ایک ہم زبان ان کے اور کہین کے عملے کے درمیان رابطے کے فرائض انجام دینے کے لئے موجود تھی۔ چند منٹ بعد ہی پولیس نے انہیں حراست میں لے لیا۔

ان کے بیگوں سے ہیر وئن نکال کر سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی گئی۔ دونوں نے جلا جلا کر بیگم نجمہ کے نام کی مالا چینی شروع کی۔

لیکن.....!

یہاں تو نگاہی الٹی بہہ رہی تھی۔ ان کو علم ہی نہ ہو سکا کہ یہ گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔ ان کی ایک ایک حرکت کو سولائیڈ پرنٹ پر منتقل کیا جا رہا ہے۔ برطانوی ”ذمہ دار اہل کاروں“ کو تضاد زیر کا وہ پیکٹ بھی موصول ہو چکا تھا جس میں دونوں ماں بیٹی اور بیگم نجمہ شیر و شکر ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ انگریزی میں تینوں کے نام تضاد زیر کی پشت پر ٹائپ کئے ہوئے تھے۔



چاہتی ہیں۔

یہی سکیم اس نے مختاراں کو سمجھائی تھی۔

فون اب مختاراں کے ہاتھ میں تھا۔

○

”سلام بیگم صاحبہ! ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں لیکن یہاں کوئی موجود نہیں۔ ہمیں تو

کچھ پتہ نہیں کدھر جانا ہے۔ یہ نو جوان اپنے ملک کا رہنے والا لگتا ہے اور ٹیکسی بھی چلاتا ہے۔ ہم

نے اس کا منتہرا کر کے فون کروایا ہے آپ اسے جگہ سمجھا دیں یہ ہمیں وہاں پہنچا دے گا۔“

مختاراں نے بڑی سادگی سے بات کی تھی۔ مقصد تو یہی تھا کہ ان لوگوں کو نجمہ بیگم کے

اور اپنے درمیان تعلق کا یقین دلانے۔

نجمہ بیگم کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ ہو کیا رہا ہے کیونکہ ارسلان نے اسے بھٹی صاحب کا

فون نمبر یا ایڈریس نہیں دیا تھا۔ بس اسے یہی بتایا تھا کہ بھٹی کے آدمی دونوں کو خود ہی وہاں ریسو کر

لیں گے اور اسے اطلاع مل جائے گی کیونکہ ارسلان خود بھی شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے دونوں

ماں بیٹی کو رخصت کر کے اپنے کچھ کام نٹانے کا بہانہ کر کے وہاں دو تین روز مزید قیام کی گنجائش

پہلے ہی سے نکال لی تھی اور چونکہ وہ اس شہر میں تھا ہی نہیں اس لئے مختاراں کو نجمہ بیگم ہی سے رابطہ

کرنا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان لوگوں کو کیا جواب دیا جائے اور کیا سمجھائے؟ وہ چکرا کر

ہی تو رہ گئی تھی۔

اس دھندلے میں کبھی کسی نے اتنی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ تو نہیں کیا؟

لیکن.....!

یہ بھی تو ممکن ہے کہ فلائٹ لیٹ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بروقت نہ پہنچے ہوں یا دوبارہ

آنے میں دیر ہو جائے۔

نجانے کتنے خیال ایک لمحے میں اس کے دل و دماغ میں آئے اور گزر گئے۔

”تم گھبراؤ نہیں۔ یہیں انتظار کرو۔ وہ لوگ ابھی پہنچنے والے ہی ہوں گے۔ اگر وہ نہ

بھی پہنچے تو میں کسی اور کو بھیج دوں گی۔ اور ہاں دیکھو ان بیگلوں کا کسی سے ذکر تک نہ کرنا خصوصاً اس

”بی بی! میرا تودل ڈوب رہا ہے۔“ نازنین نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

انہیں الگ کمرے میں لے جایا گیا تھا جہاں ایک نو جوان پہلے ہی سے موجود تھا جو ان

سے ان کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ تین گھنٹے تک تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر جو آفیسران کے

ساتھ یہاں تک آیا تھا وہ باہر چلا گیا۔ اس درمیان دونوں کو فون کے کپوں میں پینے کے لئے

چائے بھی دی گئی تھی۔

چند منٹ بعد وہ آفیسر واپس آ گیا۔ اس درمیان وہاں پہلے سے موجود نو جوان لڑکا ان

سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں کئی کام کی باتیں ان کے منہ

سے اگلوالی تھیں۔

انگریز آفیسر نے اپنی زبان میں اس نو جوان سے کچھ کہا اور اب مختاراں سے مخاطب

تھا۔

”یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹ بول رہی ہو اور تمہارا نجمہ بیگم سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم

تمہیں ٹیلی فون پر اس کا نمبر ملا دیتے ہیں۔ نجمہ بیگم سے بات کر لو۔ اگر اس نے تمہیں پہچان لیا تو

تمہاری سفارش خود ہی کردگی اور ہاں دیکھنا کہیں فون ملے ہی گرفتاری کی بات کر کے اسے گھبرانہ

دینا۔ پہلے اس سے سلام دعا کر کے اسے اپنی خیریت سے یہاں پہنچنے کی اطلاع دو۔ اس کے

بعد باقی باتیں ہم خود اس سے کر لیں گے۔ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم کہاں سے فون کر رہی

ہو۔ بس اسے یہی کہنا کہ تم نے ایئر پورٹ سے ہی فون کیا ہے..... بات سمجھ آ گئی ناں۔“

”ہاں! ہاں! ملاؤ فون۔ کمال ہے ہمیں کیوں نہ پہچانے گی۔“

خوش فہمی کی ماری مختاراں ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی

سچ ہے اور اب اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ واقعی نجمہ بیگم کا مال لے کر یہاں آئی تھی۔ اس نے نجمہ

بیگم کا نام ایڈریس، ٹیلی فون نمبر جو اپنے پاس لکھا تھا انہیں سوپ دیا۔

اس نو جوان نے اپنے سامنے رکھے ٹیلی فون پر نمبر ملایا اور اگلے ہی لمحے نجمہ بیگم لائن پر

موجود تھی۔ اس نو جوان نے نجمہ بیگم سے اپنا تعارف لندن کے ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے

کرواتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی مہمان دعویتیں جو یہاں آئی ہیں ان کے میزبان فلائٹ لیٹ

ہونے یا کسی اور سبب سے ابھی تک نہیں پہنچ سکے اور دونوں پریشان ہیں۔ آپ سے بات کرنا

نجمہ بیگم نے پتیرہ بدلتا چاہا۔ فون کے تیسرے کنارے پر موجود آفسر مسکرایا۔
دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئے کہ اب یہ مچھلی چھٹنے والی نہیں ہے
لیکن انہوں نے اپنے مطلب کی بات بہر حال جان لی تھی اور اب وہ اسے آگے تفتیش کا دائرہ
بڑھا سکتے تھے۔

اچانک ہی نوجوان کا لہجہ بدل گیا۔

اب وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

”نجمہ بیگم صاحبہ! آپ جو کوئی بھی ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہمارے
درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے جسے برٹش کراؤن کورٹ میں آپ کے خلاف بطور
ثبوت پیش کیا جائے گا۔ ان عورتوں سے دو کلو ہیر وکن برآمد ہوئی ہے اور یہ آپ کو اپنی گینگ لیڈر
بتاتی ہیں۔ آپ نے فون پر اس بات کا اقرار کر لیا ہے کہ آپ انہیں جانتی ہیں۔ آپ کو بیگم کا علم
تھا اور آپ نے مزید احتیاط برتنے کی تلقین بھی کی ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ مزید گفتگو کرتے نجمہ بیگم نے فون بند کر دیا۔

نوجوان نے مسکراتے ہوئے آفسر کی طرف دیکھا اور دوبارہ وہی نمبر ملایا۔ اس مرتبہ
جب اس نے نجمہ بیگم سے بات کرنا چاہی تو اسے بتایا گیا کہ اس جگہ کوئی نجمہ بیگم نہیں رہتی۔ تین
چار مرتبہ فون ملنے کے باوجود یہی بات دہرائی گئی جس سے انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ شکار ہاتھ
سے نکل گیا ہے۔

○

نجمہ بیگم کے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔

اس کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی گہری سازش کے جال میں پھنس گئی ہے یا پھنسا
دی گئی ہے۔

لیکن.....!

یہ سب کچھ کس نے کیا؟ کیوں کیا؟ کس کی یہ جال تھی کہ وہ یوں ناگن کے ٹل میں ہاتھ
ڈال دے؟

ارسلان!!

ٹیکسی ڈرائیور سے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ تم بالکل نہ گھبراتا۔ میں ابھی سارا
بندوبست کرتی ہوں۔“ اس نے مختار راں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی محترمہ کیا حکم ہے۔ میرے خیال سے آپ کے میزبان شاید آگے پیچھے ہو گئے
ہیں۔ بہر حال میں آپ کا ہم وطن ہوں۔ آپ مطمئن رہیں۔ مجھے ایڈریس لکھا دیں میں خود انہیں
وہاں تک پہنچاؤں گا۔“ اس نے فون پکڑتے ہی کہا۔

”دیکھئے آپ کی بہت مہربانی لیکن میرے پاس اتفاق سے میزبانوں کا فون نمبر یا
ایڈریس نہیں ہے۔ انہوں نے حال ہی میں مکان شیفیلڈ سے تبدیل کیا ہے اور اب وہ لوگ لندن آ
گئے تھے۔“

”کمال ہے آپ نے اجنبی خواتین کو نامکمل تیاری سے بھیج دیا۔ یہ بیچاریاں کہاں
جائیں گی؟ یہ تو بہت پریشان ہیں۔ آپ مجھے اپنے کسی عزیز کا ایڈریس دے دیجئے میں انہیں وہاں
پہنچا دوں گا۔ وہاں سے پھر انہیں وہ لوگ آکر لے جائیں گے۔“

○

اچانک ہی مسز نجمہ کا ماتھا ٹھکا.....!

وہ بڑی کائیاں عورت تھی۔ اتنی باتیں کرنے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے تو کبھی
مختار راں کو اپنا فون نمبر نہیں دیا تھا۔

اس کی مختار راں کے ساتھ ساری زندگی میں بالمشافہ ملاقات ہی ایک ہوئی تھی وہ بھی
ارسلان کے گھر۔

اور یہ کہ اس نے ارسلان کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ اس کا فون نمبر
انہیں دے۔

پھر یہ کیا چکر ہے؟

”اوہ میرے خدایا.....!“ اس نے اچانک ہی اپنی بے وقوفی پر اپنا سر پیٹ لیا۔
”دیکھو مسترم جو کوئی بھی ہو تمہارا شکریہ۔ میرا ان عورتوں سے کوئی خاص تعلق نہیں۔

میرے ایک ملنے والے کی یہ واقف ہیں۔ شاید انہیں کہیں سے میرا فون نمبر مل گیا ہے اور انہوں
نے مجھے فون کر دیا۔“

ہوتے ہی نجمہ بیگم کی بے چینی کو محسوس کر کے دل ہی دل میں اس صورت حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

”تمہیں کچھ علم نہیں؟ اب انجان بنے رہنے سے کیا فائدہ؟“ ”یہ کیا کمینگی کی ہے تم نے؟ احسان فراموش؟ ذلیل انسان تمہاری یہ ہمت..... تم.....“ نجمہ بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ پھٹ پڑی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو مجھے ان دو ٹکے کی طوائفوں کے ساتھ سنگٹنگ کے دھندے میں ملوث کر سکو گے؟“ وہ ہانپنے لگی۔

”اوہو! تو یہ بات ہے۔ نجمہ بیگم مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ اچھا شاید آپ کی دونوں زرخیز ملازمتیں جنہیں آپ نے ہیر و دن دے کر لندن روانہ کیا تھا گرفتار ہو چکی ہیں، لیکن اس میں گھبرانے یا مجھے گالیاں دینے والی کیا بات ہے؟“ ”یہ کیا گھٹیا حرکت ہے؟“ نجمہ بیگم نے اس کی مسکراہٹ پر چراغ پا ہو کر اس کی بات کاٹتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

”پارٹ آف دی گیم۔ اٹس پارٹ آف دی گیم۔ نجمہ بیگم۔ دیکھئے ناں نجمہ بیگم۔ یہ بہت ضروری تھا۔ بھئی انسانی فطرت بھی عجیب ہے۔ ایک بل میں انسان جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ کیا کر بیٹھے۔ اس کی سوچ کیا ہو جائے؟ نجمہ بیگم ماضی کے تلخ تجربات نے مجھے تو بہت حقیقت پسند اور احتیاط پسند بنا دیا ہے۔ آپ بہر حال سیاسی لوگ ہیں اور ظاہر ہے اب مجھے بھی اس میدان میں جھک مارنی ہے۔ جانے آپ کل کیا کر بیٹھیں۔ جیسے میرا کوئی اہم راز آپ کے پاس ہے اسی طرح آپ کی کوئی کمزوری بھی میرے پاس محفوظ ہونی چاہئے تھی تاکہ ہم ایک دوسرے کو پیلنس کر سکیں۔ نجمہ بیگم! آپ کو تو بتانے کی ضرورت نہیں کہ انسان کمینگی کرنے پر آئے تو کتنا گر سکتا ہے۔ کیا کر گزرتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے ملک صاحب آپ کے مجازی خدا تھے۔ آپ کے حکم سے انہوں نے سرتابی نہیں کی تھی۔ آپ کی خاطر انہوں نے اپنی اولاد سے ناطہ توڑے رکھا لیکن آپ نے انہیں بھی معاف نہیں کیا۔ نجمہ بیگم! آپ جیسی پڑھی لکھی خاندانی، سوشل اور معزز خاتون اگر ایسی گھٹیا حرکت کر سکتی ہے تو میرے جیسا بد معاش، دو ٹکے کا لپا لفتنگا جانے کیا کر گزرے۔ آپ کو اس بات کا احساس کرنا چاہئے تھا۔ نجمہ بیگم جنگ اور محبت میں کچھ ناجائز نہیں ہوتا۔ ہم دوست ہیں ایک دوسرے کے بزنس پارٹنر اور شاید ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے

اس نے سوچا۔ ارسلان نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ اسے پھنسا یا..... ارسلان نے اس لڑکے نے جو پالتو کتے کی طرح اس کے آگے پیچھے دم ہلایا کرتا تھا جس کو وہ جب بھی چاہے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ ارسلان کبھی ایسی جرأت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن.....!

یہ امر واقعہ تھا۔ برٹش نائٹس کنٹرول ایجنسی نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ محض ایک ٹیلی فون کال کے ذریعے انہوں نے نجمہ بیگم کے خلاف ثبوت حاصل کر لیا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے فون اٹھایا اور ارسلان کا نمبر گھمایا۔ غم و غصے سے اس کا روال روال کانپ رہا تھا۔ فون ارسلان نے خود ہی اٹھایا تھا۔ نجمہ بیگم نے اپنی آواز کو نازل رکھتے ہوئے اسے فوری ملاقات کے لئے بلایا تھا۔ ارسلان سمجھ تو گیا۔ لیکن.....!

ابھی وہ اس عورت کی بے بسی کا بہت تماشا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس بات کے لئے تیار تھا کہ اب کسی لمحے جب نجمہ بیگم پر قیامت ٹوٹے گی تو وہ اس کو کاٹ کھانے کو دوڑے گی۔

”خیریت.....؟“ اس نے مکمل انجان بننے ہوئے کہا۔ ”نور اچلے آؤ۔ ضروری بات کرنی ہے۔ شو برا ہوٹل والے آفس میں آ جانا۔“ کہہ کر نجمہ بیگم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایک زہریلی مسکراہٹ ارسلان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس نے پستول اپنی جیکٹ میں چھپایا اور نجمہ بیگم کی طرف چل دیا۔ شو برا ہوٹل میں نجمہ بیگم کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر اس دفتر کا انتخاب کیا تھا۔

”خیریت نجمہ بیگم..... آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔“ اس نے کمرے میں داخل

ہیں تو جیل بھی مل کر کاٹیں گے۔ پھر یہ سلسلہ یہاں ہی کیوں رکے۔ ظاہر ہے میں پولیس کو بتاؤں گا کہ یہ تصویر کب کی ہے؟ کس موقع کی ہے اور اس کا سیاق و سباق کیا ہے؟ تم سمجھ رہی ہوناں نجمہ بیگم۔ بھئی سجاد خان بھی آخرا فرغ کیوں بیٹھے اور پھر وہی کیوں ملک صاحب بھی کیوں نہیں۔ آخر دونوں طوائفوں کی برہنہ تصاویر ان کے ساتھ بھی تو ہیں جن میں سے کچھ تم تحفہً مجھے عنایت فرما چکی ہو۔ اس طرح بین الاقوامی نوعیت کی خبر تو بنے گی۔ میں بھی دو کوڑی کا تیسرے درجے کا سیاسی غنڈہ کم از کم آپ کے برابر عدالت میں تو کھڑا نظر آؤں گا..... اور ہاں نجمہ بیگم تمہارے لئے ایک تصاویر کا پیکٹ میں اپنے ساتھ لایا ہوں..... اس کے بعد امید ہے تم دونوں طوائفوں کو پہچانے سے انکار نہیں کرو گی۔“

اس نے جیکٹ کی جیب سے تصاویر کا پیکٹ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔ نجمہ بیگم نے بے چینی سے لپک کر تصاویر کا پیکٹ اٹھایا اور جیسے جیسے اسے دیکھتی جا رہی تھی، دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیر ہو رہی تھی۔ جتنی بے تکلفی سے یہ تصاویر مختاراں اور نازنین کے ساتھ بنائی گئی تھیں اس کے بعد دنیا کی کسی عدالت میں وہ یہ بات ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ان تصاویر کو دیکھ کر دنیا کا کوئی باریک بین شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نجمہ بیگم کو لاعلم رکھ کر بنائی گئی ہیں۔
”کستے، کستے، ذلیل، پاجی، حرام خور.....!“ وہ دیوانہ وار ارسلان کو گالیاں دے رہی تھی۔

اور ارسلان اس کی ہر گالی پر ایک سکون، ایک طمانیت اور ایک بے نام سے کیف و سرور میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

نجمہ بیگم شاید پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے ارسلان کو ہنستے دیکھ کر اسے نگلی گالیاں دینا شروع کر دی تھیں پھر اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ارسلان سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ میں برباد کروں گی تمہیں۔“

اس نے گالیاں بکتے ہوئے ارسلان سے کہا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ ارسلان دیوانہ وار قہقہے لگا کر اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے بری

ہیں۔ آپ نے اپنی محبت کا ثبوت میری تصاویر دکھا کر دے دیا تھا۔ مجھے استعمال کر کے میرے ذریعے ملک صاحب کے خلاف بلیک میلنگ سٹف حاصل کر کے دے دیا تھا۔ اب مجھے بھی تو موقعہ دیجئے ناں۔ یہ تو نا انصافی ہوئی نجمہ بیگم۔ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ تو مجھے پاؤں کی جوتی بنائے رکھیں اور میں نے اگر معمولی سا جواب دے دیا ہے تو آپ تملنا اٹھی ہیں۔“
نجمہ بیگم کے خون میں انگارے ترپنے لگے تھے۔

○

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس موزی کا ٹینٹو اباد دے۔ ارسلان نے وہ ساری تقریر معمولی ترمیم اور اضافے کے ساتھ دہرا دی تھی جو کبھی اس نے اسی طرح اس کی بے بسی کا تسخر اڑاتے ہوئے اس کے سامنے کی تھی۔ ظالم نے شاید سارے کہے ہوئے فقرے اپنے ذہن میں جانے کب سے اس وقت کے لئے محفوظ کر رکھے تھے۔
بہت گہرا اور کیا تھا اس نے۔

بڑے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ بڑے سلیقے سے اس کے دل میں زہریلا خنجر گھونپا تھا
ارسلان نے.....!

اپنی انگارہ آنکھوں اور کانپتے ہونٹوں سے وہ اس کا منہ دیکھتی رہی۔
”اور نجمہ بیگم دیکھو ناں اب تم ریاست شاہ سے شادی کرنے جا رہی ہو۔ وہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہے۔ بھی کیا پتہ جب کل تم اس کی بیوی بن جاؤ تو کہیں میرا پتہ مستقل ہی صاف نہ کروادو۔ تم نے مجھے عام حالات میں معاف نہیں کیا۔ جانے ان حالات میں کیا کر گزرو۔ میرے بزنس کا تقاضا ہے کہ تمہاری شادی ریاست شاہ سے نہ ہونے پائے۔ دیکھو! جان من ملک صاحب کی اور بات تھی۔ وہ دوسری قسم کے ٹھنڈے دل و دماغ والے لوگ ہیں۔ ان کے لئے کسی بھی آدمی کو مار دینا چیونٹی کو مسل دینے جتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ نجمہ بیگم تم نے مجھے عام حالات میں معاف نہیں کیا، خصوصی حالات میں تو مجھے جان سے ہی مار ڈالو گی..... اب کم از کم تمہاری گرفتاری کے بعد ریاست شاہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی تو کرے گا..... اور ہاں میری تم سے درخواست ہے کہ میری جو تصاویر تم نے ایمرسٹروم پر بنوائی تھیں..... مشہور زمانہ سمگلر جیفری ہاؤ کے ساتھ وہ ضرور پولیس کو پہنچا دینا۔ مجھے تمہارے کیس میں تمہارا ساتھی بننے پر بہت خوشی ہو گی..... اکٹھے موج میلہ کرتے رہے

سو پائی شاہ جی۔“ اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔
ریاست شاہ نے اس کے برابر بیٹھے ہوئے اس کو تسلی دی۔ اس کی تو خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس اچانک فیصلے نے اس کے تو ہاتھ پاؤں پھلاد دیئے تھے۔
”نجمہ بیگم اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ جیسے تم حکم کرو ویسا ہی ہوگی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی میرے دل کی حالت کا۔ کل ہمارا نکاح ہو جائے گا۔“
”نہیں شاہ جی! خدا کے لئے ابھی بندوبست کیجئے۔ اب میں آپ کی بیوی بن کر اس گھر سے باہر نکلوں گی۔ مجھے ایک خواب نے بہت پریشان کیا ہے۔ شاہ جی خدا را میری بات مان لیجئے۔“

بالآخر دو تین مرتبہ اسے سمجھانے کے بعد ریاست شاہ کو اس کی بچکانہ ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔
اس نے نجمہ بیگم کی اس ضد کو محبوب کی ادا سمجھا تھا اور اپنے محبوب کی خوشنودی کا حصول ہی اس کا مطمح نظر تھا۔
رات گئے تک دونوں ایک سادہ سی تقریب میں نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔ نجمہ بیگم کی خواہش تھی کہ اس خبر کو فی الوقت پوشیدہ رکھا جائے۔ وہ کسی اچھے وقت پر اس کا باقاعدہ اعلان کرنے کے حق میں تھی۔

ریاست شاہ نے اس کی یہ بات بھی تسلیم کر لی تھی اور اپنے خاص لوگوں کو ہی اس کا گواہ بنایا تھا۔ نجمہ کے گھر والوں، نکاح کے گواہوں اور نکاح خواں کے علاوہ اور کسی کو اس رشتے کا علم نہیں تھا۔

نجمہ بیگم نے اپنی والدہ اور گھر والوں کو خاص طور سے سمجھا دیا تا کہ وہ کسی کو بھی اس واقعے کی ہوا نہ لگنے دیں اور یہی کہا جائے کہ وہ کسی کام سے شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔
رات اس نے اپنے خاوند ریاست شاہ کے محل نما قلعے میں بسر کی اور اگلے روز دوپہر کی فلائٹ سے وہ ہنی مون منانے پہاڑی علاقے کی طرف محو پرواز تھے۔

رواگئی سے پہلے نجمہ بیگم نے اپنی ایک رازدار صحافی دوست کو فون کیا تھا۔ شاید اس نے اپنی اس خاص دوست کو جو مقامی اخبار کی صفحہ خواتین کی انچارج تھی، پہلے سے اس منصوبے کا حصہ

طرح جکڑ دیا تھا اس حرافہ کو..... اپنا انتقام اس نے بہت گھناؤنا لیا تھا.....!
پارکنگ ایریا میں پہنچنے تک نجمہ بیگم نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ بری طرح پھنس چکی ہے۔
لیکن.....!

یہ وحشت جو اس پر سوار ہو گئی تھی یہ تو اسے مار ڈالے گی۔ اس نے سوچا۔ اپنے حواس پر اس نے قابو پالیا اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہ پتا جو اسے اکیلے دیکھ کر ارسلان نے اس پر ڈھائی ہے۔ یہ زہر جو اس نے انڈیلا ہے تو اس کا کوئی تریاق بھی ضرور ہوگا۔

اس نتیجے پر تو وہ فوراً پہنچ گئی کہ اس کو فوری طور پر ایک مضبوط ڈھال حاصل کرنی ہے۔
ملک صاحب جیسا کوئی آسرا تلاش کرنا اس کے لئے ضروری تھا۔
یہی سوچ کر وہ گھر جانے کی بجائے ریاست شاہ کی محل نما کونٹھی کی طرف جا رہی تھی۔
اس کی عدت کے ایام پورے ہو چکے تھے۔ ریاست شاہ اب تک متعدد مرتبہ اس سے شادی کا تقاضا کر چکا تھا۔ اگلے ایکشن میں وہ اپنی ہونہار اور تجربہ کار سیاست دان بیوی کے ساتھ میدان میں قدم رکھنا چاہتا تھا۔
کسی بھی لمحے ایکشن شیڈول اناؤنس ہو سکتا تھا۔

کسی بھی لمحے.....!

اور نجمہ بیگم شادی کے بغیر ہی معاملات چلانے پر بضد تھی۔ اس نے پہلے سے زیادہ ریاست شاہ کی راتیں رنگین کرنا شروع کر دی تھیں، لیکن ریاست شاہ کا اپنا سوچنے کا انداز تھا۔
جب اچانک ریاست شاہ کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو ایک لمحے کے لئے وہ گڑبڑا کر ہی رہ گیا۔

”خیریت.....!“ اس نے ڈرائنگ روم میں اپنی منتظر نجمہ بیگم کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

نجمہ بیگم نے مکمل تیاری کے ساتھ حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے کار میں بیٹھے بیٹھے اپنا میک اپ درست کر کے تمام ناز و انداز کے ساتھ یہاں قدم رکھا تھا۔
”شاہ جی! مجھے آج اور اسی وقت آپ سے نکاح پڑھوانا ہے..... میں ساری رات نہیں

تم بیچ نہیں سکو گے۔“

وہ دانت پیتارہ گیا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بھنڈر نے فون اٹھایا اور حیران رہ گیا۔ دوسری طرف سے ارسلان مخاطب تھا۔

”بھنڈر صاحب بہت مدت کے بعد مجھے اپنے پرانے قرض چکانے کا موقع ملا ہے۔ میں آپ کو ایسی چیز دے سکتا ہوں جس سے آپ ملک صاحب کو برباد کر کے رکھ دیں گے۔ بھنڈر صاحب! میں گھر کا بھیدی ہوں اور لٹکا کا بھید مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ اگر آپ تیار ہیں تو میں ایک گھنٹے بعد فون کر کے ملاقات کی جگہ کا تعین کر لوں گا۔ آپ جانتے ہیں ملک میرے تعاقب میں ہے اور میں کتے کی موت مرنا نہیں چاہتا۔ آپ سوچ لیجئے۔ پھر ہم ملاقات کر لیں گے۔ خدا حافظ۔“

اس سے پہلے بد قسمتی سے اس کی ہر چال الٹی ہی پڑتی آئی تھی اور دودھ کا جلاب وہ چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتا تھا۔ وہ انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ ملک کو ہر قیمت پر اس نے ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ سانپ کے بل میں اس مرتبہ ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچنا چاہتا تھا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ ارسلان کا آج کل ملک سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ اس کی سابقہ بیوی کا سیکرٹری بنا ہوا ہے اور ملک سے کئی کترارہا ہے تو اس نے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے فون پر دونوں نے ایک جگہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ بھنڈر ملاقات کرنے اکیلا نہیں گیا تھا۔ اپنے باڈی گارڈ کو ساتھ لے گیا تھا۔ البتہ احتیاطاً اس نے گاڑی کسی دوست کی استعمال کی تھی اور اپنی شناخت چھپا کر شہر سے باہر اس ڈاک بنگلے پر پہنچا تھا جہاں ارسلان نے اسے بلایا تھا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے.....!

”بھنڈر صاحب! میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ سیدھی سادی ایک ”بزئس ڈیل“ ہے۔ ملک ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہے اور میں نے اپنی خریدیوں کا قرض چکانا ہے۔ میرے سامنے صرف آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے جو ملک سے ٹکرانے کے لئے موزوں ہے۔ آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں کہ صوبائی لیگ سے ملک صاحب نے آپ کا پتہ کٹوا دیا ہے اور کل اس کا اعلان ایک ایمر جنسی پریس کانفرنس میں کر دیا جائے گا..... اندازہ کیجئے۔ یہ کتنا خطرناک آدمی

بنارکھا تھا کیونکہ ان لوگوں کی روانگی کے اگلے ہی روز اخبارات میں یہ خبر نمایاں تھی کہ مشہور سماجی راہنما محترمہ نجمہ بیگم ممبر اسمبلی سید ریاست شاہ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکی ہیں اور یہ شاید ایک ماہ پہلے انجام پائی تھی۔ اب دونوں ہنی مون منانے شہر سے باہر نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔

نجمہ بیگم نے اپنے انداز سے اپنی شادی کی خبر کو استعمال کر لیا تھا۔ اس نے آنے والے وقت کی ابھی پیش بندی کر لی تھی۔ ارسلان نے اس پر جو گہوار کیا تھا اس کے بعد سے نجمہ بیگم کی حالت تملکائی ہوئی ناگن جیسی ہو رہی تھی۔

اس کے اندر موجود ساری شیطانیت بیدار ہو چکی تھی۔

اور وہ جلد از جلد بہت کچھ کر گزرتا چاہتی تھی۔

○

عجیب حسن اتفاق تھا.....!

جس روز نجمہ بیگم اور ریاست شاہ کی شادی کی خبر شائع ہوئی تھی اسی روز ممبر سینٹ اور بھنڈر کی مطلقہ ذکیہ بیگم اور ممتاز سیاست دان ملک صاحب کی طرف سے ایک چھوٹا سا بیان اخبارات کو جاری کر دیا گیا تھا جس میں اخبار نویسوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ان کے متعلق غلط اندازے نہ لگائیں۔ دونوں نے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن.....!

جب وہ شادی کریں گے تو اپنے اخبار نویس دوستوں کو ضرور مدعو کریں گے۔

بھنڈر کا خون کھول اٹھا تھا۔

اس کی خاندانی غیرت کو لگا رہا تھا۔

اس خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ ان کی طلاق یافتہ عورتیں دوبارہ شادی کر

لیں۔

اور عورت بھی وہ جو بھنڈر کی سابقہ منکوحہ تھی۔

”ملک تم نے بالآخر خرم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب معاملہ غیرت کا آ گیا ہے ملک! اب

زمین اور ماں

اگلے روز کے اخبارات کی سب سے دھماکہ خیز خبر ملک میں الیکشن کے انعقاد کا اعلان

تھا۔

تین ماہ بعد الیکشن منعقد کئے جا رہے تھے اور مرکزی کا بیٹہ توڑ کر نگران کا بیٹہ تشکیل دے دی گئی تھی۔

صوبائی لیگ کے لوگ جانتے تھے کہ اس سے بہترین فضا مرکزی پارٹی کو الیکشن جیتنے کے لئے پھر کب میسر آ سکتی تھی کیونکہ حالات ہر طرح سے ان کے خلاف تھے۔

پارٹی کے سیانوں نے عوام میں پارٹی کی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے بادل نخواستہ پارٹی کو ناپاک عناصر سے پاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا اعلان کرنے کے لئے دوپہر کو ہنگامی پریس کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ سارے شہر میں اس کانفرنس کے متوقع اہم اعلان پر بحث جاری تھی۔

دوپہر تک سسپنس برقرار رہا پھر ٹوٹ گیا۔ جب پارٹی کے صدر صاحب نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بھنڈر صاحب اور ان کے چار ساتھیوں کی پارٹی رکنیت ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بھنڈر گروپ کی زیادتیوں کی وجہ سے پارٹی چھوڑ کر جانے والوں سے اپیل کی کہ وہ وسیع تر ملکی مفاد کے لئے پارٹی میں واپس آ جائیں۔ ان پر پارٹی کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھلے رہیں گے۔

جاننے والے جانتے تھے کہ اشارہ ملک صاحب کی طرف ہے۔ بھنڈر گروپ پریس کانفرنس میں بغض نفیس موجود نہیں تھا، لیکن اس کے ساتھی پل پل کی خبر اسے پہنچا رہے تھے۔

جس طرح کھلے بندوں اس کی بے عزتی کی گئی تھی اور اسے پارٹی سے نکالا گیا تھا، اس حرکت نے اس کی آتش انتقام کو دو چند کر دیا۔ سہ پہر تک لندن والی کہانی کی تصدیق بھی ہو گئی۔

اب بھنڈر انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اس نے آج ہی ارسلان کو منہ مانگی قیمت دے کر تصاویر خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہے جو ایک پارٹی کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ بھنڈر صاحب جو ہتھیار ملک کو ختم کر سکتا ہے وہ صرف میرے پاس ہے۔

اس نے بھنڈر کو نجمہ بیگم اور اس کا مال لے جانے والی طوائفوں کی کہانی اور لندن میں گرفتاری کے واقعات سنانے کے بعد ان کی تصدیق کرنے کے لئے ٹیلی فون نمبر بھی دے دیا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ بھنڈر خود بھی اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔

”برٹش انٹیلی جنس کو اس بات کا دستاویزی ثبوت آپ کے خادم کے ذریعے مل چکا ہے کہ نجمہ بیگم اس گینگ کی لیڈر ہے جس کی دو عورتیں پہلے ہی گرفتار ہو چکی ہیں۔ وہ جس روز ہنری مون سے واپس لوٹے، ہتھکڑیاں پکڑے انٹر پول کی پولیس اس کی منتظر ہوگی..... اس نے ہنگامی شادی اس عذاب سے بچنے کے لئے کی ہے لیکن بھنڈر صاحب کمال کی بات تو یہ ہے کہ ملک صاحب بھی اس گروہ کے سرکردہ ممبر ہیں۔ گرفتار ہونے والی طوائف کے ساتھ ان کی خوش تصاویر میرے پاس موجود ہیں۔ ان تصاویر کی خبر جہاں ملک صاحب کو ساری زندگی کے لئے جیل میں پہنچا دے گی وہاں ان کا سیاسی کیریئر بھی تباہ ہو جائے گا۔ ممکن ہے بعد میں وہ جیل سے رہا ہو جائیں لیکن سیاست سے ان کا جنازہ اٹھ جائے گا اور ہاں سب سے بڑھ کر یہ بات کہ پھر ذکیہ بیگم ایسے ذلیل اور مجرمانہ ذہنیت کے حامل شخص کے ساتھ شادی کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ اب بھنڈر صاحب آپ نے دونوں باتوں کی تصدیق کرنی ہے۔ ایک تو اس خبر کی کہ لندن میں کیا حادثہ گزرا ہے اور دوسری آپ کے صوبائی لیگ سے اخراج کی۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ کل تک آپ کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ نجمہ بیگم کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ انٹر پول نے اس کی گرفتاری میں حائل تمام مشکلات حل کر لی ہیں۔ اگر آپ نجمہ بیگم اور ملک صاحب والی تصاویر خریدنے میں دلچسپی رکھیں تو کل دو لاکھ روپیہ پیش لے کر یہاں آ جائیں۔ میری زندگی کی یہ وہ کمائی ہوگی جو اپنے ہمراہ لے کر میں روپوش ہو جاؤں گا اور پھر باقی زندگی کے دن گمنامی میں گزار لوں گا۔ اس وقت مجھے یہی کہنا تھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ.....!“

بھنڈر ہونٹوں کی طرح اس کا منہ دیکھتا رہ گیا اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے دور ہوتا چلا گیا۔



انٹرپول پولیس نے مقامی پولیس کی مدد سے مرکزی لیگ کے ممتاز سیاست دان کی سابقہ بیوی مسز نجمہ ریاست شاہ کو ملک کے ایک پہاڑی مقام کے ایئرپورٹ سے عین ان لمحات میں گرفتار کر لیا تھا جب وہ جہاز میں اپنے خاندان سمیٹی ممبر سید ریاست علی شاہ کے ساتھ سوار ہونے جا رہی تھی۔ طرہ کی وہ ملازم ساتھی عورتیں جن کا تعلق بازار حسن سے تھا، اس کے مال سمیت لندن میں گرفتار ہو چکی تھیں اور انٹرپول کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ طرہ طویل عرصے سے یہ گھناؤنا کاروبار چلا رہی ہے۔ اس نے اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور ملک کے لئے رسوائی کا باعث بنی تھی۔

طرہ کے موجودہ خاندان سید ریاست علی نے بتایا کہ وہ نجمہ بیگم کے ماضی سے قطعی لاتعلق تھا اور ان کی شادی چند روز پیشتر ہی ہوئی تھی۔ اسے اب بھی اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بیوی کا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے۔

طرہ کے سابقہ خاندان ملک صاحب نے اس پر تبصرہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں میں علیحدگی ہو چکی ہے، لیکن وہ اپنی ازدواجی زندگی کے دوران ان کے علم میں کوئی ایسی بات نہیں رہی۔

اس خبر کی اشاعت پر دنیا میں سب سے زیادہ مسرور شخص بھنڈر تھا۔

یہ خبر اس کے لئے عطیہ خداوندی تھی!.....

قدرت نے اس کا راستہ خود سے آسان کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی مرضی کے میدان میں شکار کھیل سکتا تھا۔

کامیابی نے بڑھ کر اس کے قدم چوم لئے تھے۔

بھنڈر کے آدمیوں نے ملک کے ہر مقتدر اخبار کے رپورٹر کو اس پریس کانفرنس میں اکٹھا کیا تھا جہاں بھنڈر صاحب چونکا دینے والے حقائق کا انکشاف کرنے جا رہے تھے اور کچھ انقلابی فیصلے بھی۔

بھنڈر اپنے تین مسلح باڈی گارڈوں کے ساتھ پریس کلب میں پہنچا تو وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اخبار نویسوں سے دو گنی تعداد میں پارٹی ورکرز یہاں پہنچ چکے تھے۔

بھنڈر صاحب نے سب سے پہلے پارٹی کے کل کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے فارورڈ بلاک کے قیام کا اعلان کیا جس کا پہلے سے وہاں موجود اس کے زرخیز چچوں نے زبردست تالییاں بجا کر خیر مقدم کیا۔

وہ اگلے روز ان تصاویر کے ساتھ پریس کانفرنس کر کے عوام کو بتانا چاہتا تھا کہ ان شریف اور معزز ممبران کی اصلیت کیا ہے جنہوں نے بھنڈر کے غلط سلوک کی وجہ سے پارٹی چھوڑی اور جنہیں صوبائی لیگ والے واپسی کی دعوت دے رہے ہیں ان کے کڑوت کیا ہیں؟ اس کا نتیجہ جو بھی نکلتا وہ اس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

اس نے ملک کو ہر صورت تباہ کرنا تھا اور اس پارٹی کو بھی جس نے اس کی سیاسی ساکھ کو کوڑیوں کے مول بازار صحافت میں نیلام کر دیا تھا۔ اسے بھرے بازار میں بیچا گیا تھا پھر وہ چپ کیوں رہتا؟

غصے سے اس کے ہاتھ کی انگلی کانپ رہی تھی۔ جب اس نے ارسلان کے مہیا کردہ ٹیلی فون نمبر پر اس کے لئے رات 8 بجے ملاقات کا پیغام چھوڑا۔

بھنڈر نے چپ چاپ بریف کیس اس کے حوالے کر دیا اور جواب میں تصاویر کا پیکٹ اسے ارسلان نے تھمایا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بہت سستا سودا کیا تھا اس نے۔

ان میں سے تو ایک ایک تصویر کی قیمت دو لاکھ روپے تھی۔

”شکریہ دوست۔“ بھنڈر نے پیکٹ واسکٹ کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

”بھنڈر صاحب میں کمزور آدمی ہوں۔ اس عفریت کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس کا نام ملک صاحب ہے، لیکن میں نے آپ کے ہاتھ میں وہ ٹائم بم تھما دیا ہے جو پھٹے گا تو ملک قصہ پارینہ بن کر رہ جائے گا..... مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی قیمت وصول کر رہا ہوں، لیکن میں غریب آدمی ہوں مجبور ہوں۔ مجھے اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا ہے اور نئی زندگی وسائل کے بغیر گزارنا مشکل ہے۔“ ارسلان نے بڑے دھمکی لہجے میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔

”ارسلان! میرے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے ہیں۔ جب لوٹنا چاہو مجھے اپنا منتظر پاؤ گے!.....“ بھنڈر نے کار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھنڈر صاحب! بس اسے آخری ملاقات ہی سمجھیں۔ میں بھر پایا۔ بہت تلخ تجربات لے کر جا رہا ہوں۔ خدا آپ کو کامیابی نصیب کرے۔ خدا حافظ!.....“

صبح کے اخبارات جس کہانی کے ساتھ شائع ہوئے تھے اس نے عوام کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔

مصائب کے سنگلاخ پہاڑوں کو عبور کیا تھا انہوں نے۔

لیکن.....!

یہ عجیب صورت حال تھی۔

اس بری طرح وہ ٹریپ ہو گئے تھے کہ اب بچنے کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔

نازنین کے ساتھ ان کی بیہودہ تصاویر۔

نازنین کا لندن میں ہیر و کن سمیت گرفتار ہونا۔

نجمہ بیگم ان کی سابقہ زوجہ محترمہ کو بین الاقوامی پولیس نے نازنین کی گینگ لیڈر ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔

اب وہ کس طرح اس الزام سے بچ پاتے۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... کہ بادی النظر میں انہیں بھی اس ڈرگ مافیا کا رکن نہ سمجھا

جاتا جس کی سربراہ ان کی سابقہ بیوی تھی۔

اور اگر وہ اس الزام سے بچ بھی رہتے تو نازنین کے ساتھ ان کی تصاویر کا ذکر پولیس

میں آنے سے کوئی عقل کا اندھا ہی انہیں ووٹ ڈالتا۔

ان کی کردار کشی کس بری طرح کی گئی تھی۔

”ملک صاحب آپ کا سیاسی بوریا بستر گول.....!“ کسی نادیدہ طاقت نے ان کے ذہن میں سرگوشی کی۔

اور سب سے بڑھ کر اب یہ کہ ذکیہ بیگم شاید اس کا نام سننا بھی گوارا نہ کرے۔ ایک

رسوائے زمانہ شخص خواہ اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے رہا ہو..... اس معاشرے میں خواہ یہ

کیسا ہی گیا گزرہ معاشرہ کیوں نہ بن جائے ناقابل معافی ہے۔“

”بھنڈرا!“ ملک صاحب نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”تیری یہ مجال! میں تیری بوئیاں

کتوں کے سامنے پھینکوا دوں گا۔“

غصے اور احساس ندامت سے ان کو اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ان کے نمک خوار اخبار نویسوں نے پیشگی معذرت کر لی تھی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ

جناب والا اگر ہم یہ سکیئنڈل روک بھی لیں تو کیا ہوا؟ کوئی دوسرا اخبار اسے شائع کر دے گا اس ملک

میں کوئی دو چار اخبار ہی تو نہیں چھپتے۔

”حضرات! اب میں آپ کو اپنے اس جرم کے دستاویزی اور عکسی ثبوت دینے جا رہا

ہوں جس کی بنا پر پارٹی میں موجود سماج اور ملک دشمن عناصر میرے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔

کیونکہ میں ان زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرتا رہتا تھا جو ان کی طبع نازک پر گراں گزرتا تھا۔ آپ

نے آج ملک صاحب کی سابقہ بیگم کے کروتات اخبارات میں ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ یہ وہی

ملک صاحب ہیں جن کو ہماری پارٹی کے صدر صاحب واپس تشریف لانے کی دعوت دے رہے

ہیں۔

حضرات! ملک صاحب نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی

سابقہ چہیتی بیگم صاحبہ کے کالے کروتات سے قطعی لاعلم تھے۔ خدا کی پناہ یہ اس صدی کا سب سے

بڑا جھوٹ ہے۔ ڈرگ مافیا کا سب سے بڑا کرتا دھرتا یہی ملک صاحب ہے۔“

اتنا کہہ کر اس نے تصاویر کا بنڈل اپنے ایک ساتھی کو دیا جس نے اخبار نویسوں میں

تصاویر بانٹنی شروع کر دیں۔

ان تصاویر نے پولیس کا نفرنس پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

اچانک بھنڈر کی گونجدار آواز سنائی دی۔

”محترم اخبار نویس بھائیو! آپ ان تصاویر کے تمام کرداروں کو پہچانتے ہیں۔ اگر ان

میں سے کوئی تصویر جعلی یا فوٹو گرافر کا کمال ثابت ہو جائے تو مجھے اس شہر کے چوراہے میں پھانسی پر

لٹکا دیجئے..... بصورت دیگر ان مجرموں کو عدالت میں لایئے جو آپ کے راہنما بنے ہوئے ہیں۔

میں نے اپنی جان پر کھیل کر ان کے کالے چہروں سے نقاب اٹھا دیئے ہیں۔ اب فیصلہ آپ کریں

کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟“

بھنڈر صاحب کی پولیس کا نفرنس نے سنسنی پھیلا دی تھی۔

ملک صاحب کے پروردہ رپورٹر خبر اور تصاویر لے کر اڑتے ہوئے سیدھے ان کے

حضور پہنچے تھے۔

نجمہ کی گرفتاری نے پہلے ہی ملک صاحب کے اعصاب توڑے ہوئے تھے اور انہوں

نے بمشکل خود کو سنبھالا دیا تھا کہ یہ نئی پتا آن پڑی۔

تصاویر دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تو ملک صاحب مبہوت ہو کر ہی رہ گئے۔ انہیں سمجھ

نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

زندگی میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے ملک صاحب نے..... مشکلات و

”میں دیکھتا ہوں کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔
اب تک تین چار گولیاں اس نے اپنے دل و دماغ کو قابو رکھنے کے لئے زہر مار کر لی تھیں۔
کچھ سوچتے ہوئے اس نے ایک فون نمبر ملایا اور وہاں موجود شخص کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دے کر فون بند کر دیا۔
تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنی نئی کار میں اس طرف جا رہے تھے جہاں انہوں نے فون کیا تھا۔

○

یہ شہر کی ماڈرن آبادی کا ایک خاموش کونہ تھا جہاں ایک سر بفلک عمارت کے سامنے پہنچ کر ملک صاحب کے ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ شاید کسی نے اندر سے انہیں دیکھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ گاڑی برآمدے کے سامنے رکی تھی۔

ملک صاحب کا استقبال ان کے لئے ایک ”آف دی ریکارڈ“ دوست نے کیا۔!

یہ چوہدری صاحب تھے۔!

چوہدری صاحب کا شمار ملک کے ان گئے چنے سرمایہ داروں میں ہوتا تھا جو سیاسی پارٹیوں پر انویسٹمنٹ کیا کرتے تھے۔

ایک لگا کر دس کمانے والے چوہدری صاحب نے ملک صاحب کو پریشان دیکھا تو ان سے کئی گنا زیادہ پریشان نظر آنے کی اداکاری کرنے لگا۔

”نوید کو فوراً بلائیے۔“ ملک صاحب نے ایک خصوصی آرام دہ کمرے میں داخل ہوتے ہی چوہدری صاحب سے کہا۔

نوید اسی گھر میں چھپا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت وہاں موجود تھا۔

چوہدری صاحب ان کے لئے چائے پانی کا بندوبست کرنے چلے گئے جب کہ ملک صاحب نے ان تینوں سے خیر خیریت دریافت کرنا شروع کر دی تھی۔

”نوید میرے پاس وقت کم ہے۔ اب حق نمک ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے ”اوپر والوں“ سے اجازت لے لی ہے بلکہ یوں سمجھو کہ سودے بازی کر لی ہے۔ تم ماننے ہو کہ مرکزی پارٹی نے یہ الیکشن بہر صورت جیتنا ہے۔ اس حلقے سے ہمارے صدر صاحب کے کاغذات بھی تکلفاً داخل کئے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے وہ یہ سیٹ جیت کر چھوڑیں گے اور ضمنی انتخابات میں تم

اسمبلی ممبر بن کر بچوں پر بیٹھو گے۔۔۔۔۔ یہ طے شدہ بات ہے جس کا ثبوت تمہیں جلد ہی مل جائے گا۔۔۔۔۔ نوید! میں اپنے دوستوں کا اتنا ہی دوست ہوں جتنا اپنے دشمنوں کا دشمن۔ میں اپنے دوست اور دشمن دونوں کا آخری سرحد تک ساتھ دیتا ہوں۔ ہمیں یہ سیٹ اور تمہاری تمام مقدمات سے رہائی کی کچھ قیمت ادا کرنی ہے۔ میں آج رات یا کل صبح تک جیل پہنچ جاؤں گا۔ اگلے دو روز کے اندر اندر تم بھنڈر اور ارسلان کو مار ڈالو۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔ میں جانتا ہوں ارسلان آج کل غائب ہے لیکن وہ تمہاری نظروں سے چھپ نہیں سکتا۔ اس نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے۔ آستین کا سانپ ثابت ہوا ہے وہ لوٹڈا تم جانتے ہو میں نے اس حرامی کو۔۔۔۔۔ اس زمین پر ریگنے والے کیڑے کو آسمان کی بلند یوں پر پہنچایا اور اس نے۔۔۔۔۔ اور اس نے مجھ ہی کو ڈس لیا۔۔۔۔۔ مار ڈالو۔۔۔۔۔ اسے ہر صورت میں ڈھونڈ کر مار ڈالو اور دیکھو اسے آسان موت نہ مارنا۔ کتے کی موت مارنا اسے۔۔۔۔۔ سکا سکا کر۔۔۔۔۔ بھنڈر کو البتہ رعایت دے دینا۔ بوڑھا آدمی ہے بے چارہ۔۔۔۔۔“ ملک اور اس کے ہمراہیوں کے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے تھے۔
ایک مودب ملازم ”چائے پانی“ گھسیٹا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔

ایک ٹرائل میں چائے کم اور ”پانی“ زیادہ تھا۔

چاروں اس ”پانی“ پر نندیدے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

ملک نے ایک کونے میں رکھے انٹرکام پر چوہدری صاحب سے بات کی اور تھوڑی دیر میں ایک بریف کیس ان تک پہنچ گیا۔

”دو لاکھ روپے ہیں یہ۔۔۔۔۔ ابتدائی اخراجات۔ پانی کی طرح پیسہ بہا دو لیکن دونوں میں سے کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔“ اس نے بریف کیس کھول کر نوید کے سامنے کر دیا۔

”ملک جی! ہم آپ کے نمک خوار ہیں۔ آپ کی طرف اٹھنے والے ہر ہاتھ کو کاٹنا ہمارا فرض ہے۔ بس آپ کو بہت جلدی خبر مل جائے گی۔۔۔۔۔ نوید نے آج تک آپ کا کوئی حکم نہیں ٹالا۔“

اس نے قہقہہ لگا کر بریف کیس بند کر دیا۔

ساری رات اس کٹھی میں ملک صاحب اپنا غم غلط کرتے رہے۔ یہاں شراب اور

شباب انہیں میسر تھے۔۔۔۔۔ اور یہ حوصلہ بھی کہ وہ اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔

انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ اسمبلی میں نہیں جائیں گے تو پھر کوئی نہیں جائے گا۔ ان کے بغیر

اسمبلی کیا سیاست کیا اور حکومت کیا؟

جیل میں آیا ہوا ہے..... سمجھ گئے ناں آپ۔ سمجھدار ہو بادشاہو! آخر خاندانی سیاست دان ہو.....
بھنڈر صاحب جیل میں الارم ہوگا اور ملک مارا جائے گا..... کسی کوکانوں کان خبر نہ ہوگی اور آپ کی
طرف تو کسی کا خیال تک نہیں جائے گا..... کیا سمجھے بادشاہو! آخر ہم آپ کے نمک خوار ہیں۔ ہم
آپ کا بھلا نہیں سوچیں گے تو کون سوچے گا!.....“
تجو بھنڈر کے دل کو لگی تھی۔

ایسا سنہری موقعہ کب ملتا..... فیقا اس کے لئے جان پر کھیل سکتا تھا..... اور یہ تو منصوبہ
ہی بڑا سیدھا سا تھا۔ آج سے تین سال پہلے بھی انہوں نے اپنے گاؤں کے ایک میراثی کو جس
نے بد معاشی شروع کر دی تھی اور ان کے منہ کو آنے لگا تھا اسی طرح ایک اور جیل میں آدمیوں سے
الارم کروا کے مروا ڈالا تھا۔

کسی کوکانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

انکوائری کمیشن بنا.....!

اور بات آئی گئی ہوگئی۔

”جیرے میراثی کی طرح کسی کوکانوں کان خبر نہ ہوگی بھنڈر صاحب!“

بد معاش کی نظریں بھنڈر کے نوٹوں پر تھیں۔

”ٹھیک ہے..... شام کو رقم لے لینا لیکن.....“

”بادشاہو! مالکو! بس اب لیکن ویکن کو جانے دو۔ اب ہمارے ہاتھ بھی دیکھنا۔ سالے

کی تکابوٹی نہ کروادوں تو کہنا کہ اپنی کا جنا نہیں تھا۔“

شام کو بد معاش نے رقم وصول کر لی۔

اگلے روز جیل میں اس نے فیقے قاتل سے ملاقات کر کے اسے آدھی رقم دی اور منصوبہ

سمجھا دیا۔

معاملہ طے پا گیا!.....

○

ارسلان کو انہوں نے ہر ممکن ذرائع سے تلاش کیا تھا، لیکن اس کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا

تھا۔

خدا جانے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔

اس روز جب نوید کے ساتھی نے ملک صاحب سے جیل میں ملاقات کی تو ان کا پارہ

دوسرے روز کے اخبارات نے لوگوں کو چونکا کر رکھ دیا..... ملک صاحب کا
سیکنڈل، بھنڈر صاحب کی پریس کانفرنس، نجمہ بیگم کے متعلق تازہ انکشافات!
ایسی ایسی سرخیوں بجائی تھیں اخبارات نے کہ لوگ تھرا کر رہ گئے..... ملک کے تمام
دفتراور گھروں میں یہی معاملات زیر بحث رہے۔

بھنڈر کی گردن میں سریاٹ ہو چکا تھا!.....
اس کے ہمنوا اور چیچے اسے ہر طرف سے یہی ”فیڈ بیک“ دے رہے تھے اس کا آزاد
گروپ تمام سٹیٹس جیت کر اسمبلی میں پہنچے گا۔

اس کے دسترخوان پر پلٹے اور چند سکوں کی خاطر اس کے آگے پیچھے دم ہلانے والے
سیاسی تجزیہ نگاروں نے اپنے کاموں میں ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگلی اسمبلی میں کوئی
حکومت بھنڈر گروپ کی مرضی کے بغیر برسرِ اقتدار نہیں آ سکتی اور وہ جب چاہے حکومت کی ایسی
تیمیں کر کے رکھ دے گا۔

عین ان لمحات میں جب وہ اپنے کرم فرماؤں کی مبارکبادیں موصول کر رہا تھا اس کے
پروردہ ایک بد معاش نے بھنڈر کو ایسی خبر پہنچادی کہ جوشِ مسرت سے بھنڈر چھٹنے کو آ گیا۔

”ملک کو پولیس نے گرفتار کر لیا..... جوڈیشل ریماڈ پر جیل پہنچا دیا گیا ہے۔“
بد معاش نے بتایا۔

”ذات کی کوڑھ کر لی اور شیریں کو چھپے..... سالہ! دوٹکے کا کتا اور ہم جیسے خاندانیوں
سے مٹھا لگانے چلا تھا!.....“ بھنڈر نے قہقہہ بلند کیا۔

”بھنڈر صاحب! قدرت نے سنہری موقعہ دیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس کا منٹنا ہی ختم
کر وادیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ بھنڈر صاحب! دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہئے.....
یہ بڑی پرانی جوٹھ ہے۔ مرا ہوا ہاتھی سوالا کھا کھا ہوتا ہے۔ اس سالے کا پیہ نہیں کوئی اور ڈرامہ رچا کر
دوبارہ ہیر وین جائے..... بھنڈر صاحب! بادشاہو! ویلے تو آپ مالک ہیں لیکن ہم نے بھی زمانہ
دیکھا ہے۔ بادشاہو! اگر موقع مل ہی گیا ہے.....“ بد معاش کے مشورے نے بھنڈر کے دل کی
دھڑکنیں دوچند کر دی تھیں۔

”لیکن کیسے..... کیسے؟“ اس نے بے قراری اور دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

”صرف دو لاکھ کا کھیل ہے بھنڈر صاحب۔ صرف دو لاکھ کا..... جیل کے اندر ہی مروا
دیں گے سالے کو..... کسی کوکانوں کان خبر نہ ہوگی..... بھنڈر صاحب فیقے کا چالان آج کل اسی

کے لئے ہی کیا گیا تھا..... اور اچانک ہی جو انہیں درجنوں قیدیوں نے زرنے میں لے لیا تھا۔ یہ بھی سوچی سمجھی سازش تھی.....!

اس سے پہلے کہ ملک صاحب کی تقریر جاری ہوتی، ہجوم میں سے کسی نے زہریلا خنجر ان کے کلیجے میں تار دیا۔ ملک صاحب پر یکے بعد دیگرے پندرہ وار کئے گئے تھے۔ ان کی چیخ چنگھاڑ پر کوئی کان کیا دھرتا۔

وہاں..... سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔

کیونکہ جیل کا الارم ہو گیا تھا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے اپنی مدد کے لئے سول لائن سے گارڈ طلب کر لی تھی اور اب سینکڑوں ڈنڈہ بردار سپاہی اس طرف بھاگتے ہوئے آرہے تھے۔

ایک طرف قیدیوں اور پولیس میں ہاتھ پائی ہو رہی تھی اور دوسری طرف ملک صاحب کی لاش قیدیوں کے پاؤں تلے روندی جا رہی تھی۔

جدھر جس کے سینگ سمائے وہ اس طرف منہ اٹھا کر بھاگنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد جب ہنگامہ فرو ہوا تو جیل والوں نے دیکھا کہ پندرہ شدید زخمی قیدیوں کے ساتھ ساتھ ایک ”مردہ قیدی“ بھی موجود ہے۔

بی کلاس کے حوالاتی کی موت، وہ بھی خنجر کے زخموں سے۔ جیل والوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

وہ جان گئے کہ مرنے والا کون ہے؟

انہیں یہ بھی سمجھ آ گئی کہ اسے ”قتل“ کرنے کے لئے یہ سارا کھیل رچایا گیا ہے۔ لیکن.....!

اس کے قاتلوں کو کہاں تلاش کیا جائے؟

اس سوال نے انہیں چکرا کر رکھ دیا تھا۔

○

بھنڈر حسب معمول اپنے ایک اونگھتے ہوئے باڈی گارڈ اور ڈرائیور کے ساتھ سیر کرنے آیا تھا۔

آسمان کو چھو رہا تھا۔

”حرام خور! مجھے یہاں جیل میں رکھ کر خود گھڑے اڑا رہے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتا تو کیا تم اندھوں کو بھنڈر نظر نہیں آتا..... میں نے وکیل کو ضمانت سے روک رکھا ہے کہ پہلے ان دونوں کا صفایا ہو جائے تو پھر ضمانت کرواؤں..... کل ہر صورت اسے مرجانا چاہئے ورنہ پھر.....“

ملک کی تلخی اور دھمکی آمیز لہجے نے نوید کے ساتھی کے پسینے چھڑا دیئے تھے۔

”ٹھیک ہے ملک صاحب! پرسوں صبح کا سورج بھنڈر کے نصیب میں نہیں ہوگا۔ آپ

بے فکر ہو جائیں۔ ہم تو چاہتے تھے چھوٹا کام پہلے ہو جائے۔“

”دفع ہو جاؤ اور کام مکمل کئے بغیر مجھے اپنی شکلیں نہ دکھانا۔“

اس نے واپسی پر جب یہ پیغام نوید کو پہنچایا تو وہ سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوگا۔ واقعی اگر ملک نے اس وقت ان کے سروں سے ہاتھ اٹھالیا تو پھر ان کی حالت ان آوارہ کتوں جیسی ہو جائے گی جنہیں کارپوریشن کے لوگ زبردے کر مار دیا کرتے تھے۔

”یار کل بہر صورت بھنڈر کا کام ہو جانا چاہئے۔ تم آج رات مجھے ڈکیت اور شرلی کو بلا لاؤ۔ کل صبح وہ سیر کرنے کو نکلے تو سالے کا ”بولورام“ کرادو..... صبح وہاں کون سی پولیس ہمارے لئے ناکہ لگا کر بیٹھی ہوگی۔“

○

اگلے روز جیسے ہی جیل کی قیدیوں کی کنتی کھلی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بی کلاس کے ساتھ والی بیرک میں قیدیوں نے لنگریوں سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔ ایک قیدی نے جیل کی طرف سے تقسیم کی جانے والی سبزی میں سے کوئی شے نکال کر باقی قیدیوں کو دکھائی۔ اس کے ساتھ ہی قیدی گالیاں بکتے لنگر تقسیم کرنے والوں اور ان کے ساتھ موجود جیل کے عملے پر پل پڑے۔

چند منٹ ہی میں وہاں گھسان کارن پڑ گیا تھا۔

ساتھ والی بیرک کے قیدیوں نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ جیل کے عملے کو گالیاں بکتے جیل کے چکر کی طرف آنے لگے۔

ملک صاحب بی کلاس کے احاطے میں ٹہل رہے تھے جب انہوں نے ایک طوفان

بدتمیزی اٹھاتے دیکھا۔

اپنی لیڈری چکانے کا یہ موقع وہ ہاتھ سے کیوں کھوتے، یہی سوچ کر وہ آگے بڑھے۔

چند منٹ بعد وہ قیدیوں کے اس گروہ میں پھنس کر رہ گئے۔ وہ یہ نہ جان سکے کہ یہ سارا ہنگامہ ان

کیا..... وہ لوگ تو زخمی کو بھی اللہ کے آسرے پر ہی چھوڑ کر اپنی راہ لیتے لیکن اس درمیان سیرگاہ میں موجود تین چار نوجوان جو گنگ کرتے وہاں پہنچ گئے تھے جنہوں نے پولیس کا ردیکھ لی تھی۔ ایک مہربان پولیس افسر نے یہ ضرور کیا کہ کنٹرول کو مشتبہ کار کے فرار کی اطلاع دے دی۔ انہیں امید تھی کہ اب مجرم بچ نہیں پائیں گے۔

O

کمانڈر انچیف پر روز بروز دباؤ بڑھ رہا تھا۔ شمالی کمانڈ کی رپورٹ ان کے سامنے رکھی تھی اور اٹلی جنس ڈائریکٹر فائلیں سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کور کمانڈر کے ساتھ ان کی طویل میٹنگ ہو چکی تھی۔

”جناب والا! تمام شواہد آپ کے سامنے ہیں..... وطن فروش تو یہ لوگ پہلے سے تھے لیکن اس طرح بڑھ چڑھ کر ملک و قوم کی عزت اور وقار کی بولی لگائی جائے گی اس کا تصور بھی ہم نے نہیں کیا تھا..... سر! تمام حالات آپ کے سامنے ہیں۔ غیر ملکی سفیروں کے ساتھ ان غداروں کی میٹنگز اور گھنگو کی ریکارڈنگ آپ نے سن لی۔ اب سے ایک گھنٹہ پہلے کی اطلاعات کے مطابق اب تک صرف شہروں کی حد تک 23 سیاسی کارکن مختلف پارٹیوں کے مارے جا چکے ہیں..... کرفیو کے باوجود دلوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔ ہماری مجبوری ہے جناب والا کہ ہم اپنے عوام پر گولی نہیں چلا سکتے اور یہ سارے بندر اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انار کی میں روز بروز اضافہ کر رہے ہیں۔ آج تین پارٹیوں کی طرف سے ملک کے دارالحکومت میں جلوس نکالنے کے اعلانات کئے گئے ہیں جس سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔

جناب والا! بھنڈر اور ملک کے قتلوں سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ رکتا نظر نہیں آ رہا..... لوگوں میں مایوسی بڑھ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سرحدوں پر دشمن اپنے دباؤ میں اضافہ کر رہا ہے..... تحریک کاروں کی آمد جناب کے علم میں ہے۔ دشمن ہر روز نئے ”لائچنگ پیڈ“ تیار کر رہا ہے۔ ہمارے لئے ایک ہی وقت میں دشمن افواج اور سیاستدانوں پر نظر رکھنا بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے..... دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر خطرناک ثابت ہوئے ہیں جناب والا!“

اتنا کہنے کے بعد اٹلی جنس ڈائریکٹر نے باری باری فائلیں کھول کر کمانڈر انچیف کو پڑھانی شروع کر دیں۔

اس کو اپنے بزرگوں سے یہی ایک اچھی عادت ورثے میں منتقل ہوئی تھی۔ یوں بھی اس کو ڈاکٹروں نے کہہ رکھا تھا کہ اس کی زندگی کی گاڑی اسی طرح چلے گی اگر وہ ہلکی پھلکی ورزش جاری رکھے ورنہ صرف دواؤں سے کام چلتا نظر نہیں آتا۔ یوں بھی بھنڈر صاحب مستقبل کے وزیر بننے جا رہے تھے۔ اس لئے انہیں آج کل اپنی صحت کی کچھ زیادہ ہی فکر رہتی تھی۔

باڈی گارڈ بے چارے کی جان خواہ مخواہ عذاب میں آگئی تھی۔ اس کی نیند کبھی قسمت ہی سے پوری ہوئی تھی۔ آج کل تو وہ بڑی سنجیدگی سے استعفیٰ دینے کی سوچ رہا تھا۔ ”الو کے پٹھے بندوق ہاتھ میں رکھا کرو۔ یہ گلے میں لٹکانے کے لئے نہیں دے رکھی تمہیں۔ ہر وقت اسے گلے کا ہار بنائے رکھتے ہو۔“

بھنڈر صاحب نے گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہوئے باڈی گارڈ کو ڈانٹا۔ جس نے بندوق کو سکول کے بچوں کے بستے کی طرح گلے میں لٹکا کر ان کے لئے دروازہ کھولا تھا۔ جیسے ہی بھنڈر صاحب نے باغ کی طرف قدم بڑھایا۔ عذاب کی طرح ایک کار اس سے ٹکرائی۔ یوں لگتا تھا جیسے کار کو اناڑی چلا رہا ہے۔ جس سے اسٹیرنگ پر قابو نہیں رکھ جا رہا تھا۔ لیکن یہ بڑا کھلاڑی ڈرائیور تھا.....!

بھنڈر کو روکد کر اس نے اچانک بریک لگائے۔ اس کے ساتھ ہی کار کے دروازے کھل گئے۔

تین مسلح آدمیوں نے جنہوں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ زمین پر کراہتے بھنڈر اور اس کے باڈی گارڈ پر گولیوں کا مینہ برسا دیا۔

دونوں چند لمحے مائی بے آب کی طرح تڑپے اور ٹھنڈے ہو گئے.....! بھنڈر صاحب کی کار گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھی..... ان کے ڈرائیور کو ایک ہی گولی نے زمین بوس کر دیا تھا اور یہی ”زمین بوسی“ اس کی زندگی بچا گئی کہ حملہ آور اسے مردہ سمجھ کر فرار ہو گئے۔

نیم مردہ ڈرائیور کو پولیس کی ایک گشتی کار نے اٹھایا تھا جنہوں نے قاتلوں کو فرار ہوتے تو دیکھ لیا تھا لیکن اس خوف سے کہ مجرموں کے پاس عموماً جدید اسلحہ ہوتا ہے مجرموں کا تعاقب نہ

انتظامی عہدوں پر فائز کیا جائے۔

کمانڈر انچیف صاحب ان کی مشروط پیشکش کا مسکرا کر شکریہ ادا کر دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ جو لوگ اس طرح کی پیشکش کر رہے ہیں ان میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو عام حالات میں اپنے حلقے سے منتخب ہو کر اسمبلی میں بھی نہیں پہنچ سکتے۔

اگلے روز کور کمانڈر کے ساتھ کمانڈر انچیف کی انتہائی خفیہ میٹنگ جو شام ڈھلے شروع ہوئی تھی، صبح ہونے تک چلتی رہی۔

ملکی حالات کا سب نے تفصیلی جائزہ لیا۔ خدمات اور ممکنہ خطرات کی نشاندہی اپنی بصیرت کے مطابق کی۔ آدھی رات تک وہ لوگ کچھ عرصے کے لئے ملک میں مارشل لاء نافذ کرنے پر اصولی طور پر رضامند ہو چکے تھے۔

صبح ہونے تک انہوں نے مارشل لاء کی صورت میں ممکنہ رد عمل اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

میٹنگ کے خاتمے پر جب کور کمانڈر نے اپنے اپنے ہیڈ کوارٹرز کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو سول انٹیلی جنس کے اہلکاروں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

وزیراعظم کو سول انٹیلی جنس کے سربراہ نے جو ان کے دست راست بھی سمجھے جاتے تھے، اگلے چوبیس گھنٹوں میں کسی بھی ممکنہ اور ”انتہائی اقدام“ کی اطلاع دے کر ان کی نیند حرام کر دی تھی۔

جب وزیراعظم صاحب اپنی کابینہ سے رابطہ کر رہے تھے عین ان لمحات میں سول انٹیلی جنس کے کچھ افسران اپنا مال و متاع سمیٹ کر بیرون ملک فرار کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے ہر غیر قانونی حربہ روا رکھا تھا۔ اپنی حدود اور قانونی اختیارات کا ناجائز استعمال کیا تھا اور جو جانتے تھے کہ مجاہد کا خوفناک اثر دہا نہیں ضرور نگل جائے گا۔

○

رات گئے کابینہ کا ہنگامی اجلاس چل رہا تھا۔ جب وزیراعظم کو ان کے سیکرٹری نے براہ راست اطلاع دی کہ دارالحکومت پر فوج نے یلغار کر دی ہے اور ٹینکوں اور فوجی ٹرکوں کو وزیراعظم

ہر فائل کے مطالعے کے بعد ان کے ماتھے پر ایک اور بل آ جاتا۔ ان کی کینٹیوں کے بل ابھرنے لگے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے کمانڈر انچیف نے اپنے اندر چھلنے طوفان کو زبردستی دبا رکھا ہو..... انہوں نے اپنے اظہار کے سامنے ضبط کا جو بند باندھ رکھا تھا، وہ بالآخر ٹوٹ گیا۔ جب ان کی موجودگی میں دو پارٹیوں کے جلوسوں کے آپس میں ٹکرا جانے کی اطلاع دیں موصول ہو گئی۔ ملٹری انٹیلی جنس کے مستعد اہلکار ایک ایک لمحے کی رپورٹ اپنے افسران اعلیٰ تک پہنچا رہے تھے۔

کمانڈر انچیف نے چند منٹ کی مزید کارروائی کے بعد اجلاس ملتوی کر دیا۔ انہوں نے اگلے روز شام کو تمام کور کمانڈرز کو خصوصی میٹنگ کے لئے طلب کر لیا تھا۔

میٹنگ سے فراغت پر کمانڈر انچیف سیدھے وزیراعظم سے خصوصی ملاقات کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے تین گھنٹے تک وزیراعظم اور ان کی نگران کابینہ کو بریفنگ دی اور ان سے اپیل کی کہ وسیع تر ملکی مفاد کے پیش نظر وہ لوگ اپنی ذات خواہشات اور ترجیحات ایک طرف رکھ کر ملک میں امن و امان کی فضا قائم رکھنے پر توجہ صرف کریں۔ انہوں نے حکومت کو تفصیل سے دشمن افواج کی نقل و حرکت سے مطلع کر دیا تھا۔

لیکن.....!

وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی باتیں لوگوں کے سر سے ہی پھسل جاتی ہیں۔ تین گھنٹے کی طویل میٹنگ میں انہوں نے حکومت کے منہ سے سوائے اپوزیشن کے خلاف الزامات کی جو چھاڑ کے اور کچھ نہیں سنا تھا۔ یہ لوگ حالات کی باہمی کی ساری ذمہ داری اپوزیشن پر ڈال رہے تھے۔ کمانڈر انچیف اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب وزیراعظم ہاؤس سے رخصت ہوئے تو انہیں خاصی مایوسی کا سامنا تھا۔

اسی روز شام کو انہوں نے اپوزیشن رہنماؤں سے الگ ملاقات کی۔ ہر لیڈر تباہی کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال رہا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد ان لیڈران اکرام کی تھی جو مخالفین کے خلاف زہر افشانی کرتے کرتے کمانڈر انچیف صاحب کو اعتماد میں لے کر مارشل لاء لگانے کا مشورہ دیتے اور اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے ان سے درخواست کرتے کہ جب مارشل لاء لگ جائے تو ان کی خدمات سے ضرور استفادہ کیا جائے اور نگران وزارتوں یا دیگر اعلیٰ سول

ہمسایہ ملک سے امریکہ پہنچنے تک کی کہانی تین ماہ پر محیط تھی۔ اس کے پاس زاوراہ بہت تھا۔

سارا سرمایہ اس نے محفوظ کر لیا تھا۔

لندن میں وہ اپنی جس شناخت کے ساتھ داخل ہوا تھا اس کا علم سوائے اس کے کسی اور کو نہیں تھا۔ اپنے ماضی کے ہر حوالے سے اس نے ناطہ توڑ لیا تھا۔

اب اسے نئی پہچان کے ساتھ زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ اس نے امریکہ میں اپنی جڑوں سے کٹ کر جینا شروع کیا تھا۔

وہ ”منی پلانٹ“ بن گیا تھا۔

خود رو درخت.....!

ایسا پودا جسے بڑے لوگ سجاوٹ کے لئے اپنے کمروں میں گملوں میں لگایا کرتے تھے۔

بغیر پھل پھول اور خوشبو کے اسے صرف اپنے وجود سے لپٹے بچوں کے ساتھ جینا تھا۔ مائیکل کو اس نے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ بہت کچھ مائیکل نے خود سمجھ لیا تھا۔ اس نے ایک اور شناخت کے ساتھ ارسلان کو امریکہ پہنچایا تھا۔

اب اس کے رابطے شمالی امریکہ کے مافیا سے استوار تھے۔ اب اس کی حیثیت ایک ”پانڈی“ والی تھی۔

مال یہاں سے وہاں لے جانا سودے کرنا، مال پہنچانا اور اپنی کمیشن وصول کرنا۔ اس نے کیلی فورنیا کے شہر فرانسسکو میں اپنا گھر بنالیا تھا..... عیاشی کا ہر سامان اسے میسر تھا۔ اس نے خود کو شراب شباب تک محدود کر لیا تھا۔ زندگی کو اس نے کسی تیسرے حوالے سے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

جب کبھی گمشدہ محبتیں، زمینی لوگ اور حوالے یاد آتے تو وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگا کر خود کو غرق سے کر لیتا۔ اب تک دو مرتبہ اس نے خطیر رقم اپنی بہن کو اپنا پیہ دیئے بغیر پہنچا دی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کبھی ایک کوڑی اس سے وصول نہیں کرے گی لیکن بیوہ بہن کی بات اور تھی۔

ہاؤس کی طرف بڑھتے دیکھا گیا ہے۔

وزیراعظم نے لپک کر فون اٹھایا کہ سول انٹیلی جنس کے سربراہ سے رابطہ کر کے حالات کی اصلیت جاننے کی کوشش کریں لیکن فون ڈیڈ تھا.....!

”دوستو! خود کو آنے والے حالات کے لئے تیار کر لو۔ فوج نے گھیراؤ ال لیا ہے۔“ وزیراعظم نے بڑی ہمت سے اپنے ساتھیوں کو باخبر کیا جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”افسوس ہماری بد اعمالیوں نے ہمیں یہ دن دکھائے۔“ ایک وزیر صاحب نے گوہر نشانی کی۔

وہ لوگ میٹنگ روم میں سر جھکائے بیٹھے تھے جب فوج کے دو موبد اعلیٰ افران وہاں آگئے جنہوں نے بڑے مودبانہ لہجے میں انہیں مارشل لاء کی اطلاع دے کر خود کو ”ہاؤس اریسٹ“ سمجھنے کی درخواست کی۔ انہیں بتایا گیا کہ ان کی حفاظت کے لئے فوج انہیں کچھ دن اپنی نگرانی میں رکھے گی۔

ساری کابینہ ہونٹوں کی طرح فوجی افران کے احکامات سنتی رہی۔ کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

سب نے خود کو تسم ظریفی حالات کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

○

ارسلان نے ملک میں مارشل لاء لگنے کی خبر ہمسایہ ملک کے ایک ہوٹل میں پڑھی اور ٹی وی کی خبروں میں سنی اور دیکھی تھی۔

اسے ملک سے فرار ہوئے آج دس روز ہونے کو آئے تھے۔ اپنے ملک سے براہ راست یورپ جانے کی بجائے اس نے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے یورپ پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”تم اسی قابل تھے حرام خور! تم انسان نہیں انسانوں کے روپ میں بسنے والے درندے ہو کاش تمہارے لئے خدا کا کوئی خصوصی عذاب مقرر اور متعین ہو جائے اور میری بد قسمت قوم تم سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لے۔“ اس نے دل ہی دل میں سیاست دانوں کو مٹھون کیا۔

اسے اپنی بہن کے بیوہ ہونے کی اطلاع اسی ملک میں ملی تھی۔ نجانے کیوں ابھی تک وہ اپنے گھریلو حالات سے باخبر رہتا تھا..... حالانکہ اسے اب ایسا نہیں سوچنا تھا۔ اس نے سوچا۔
لیکن.....!

ہر سوچ کو رو بہ عمل لانے پر اسے اختیار نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ اسے اپنے آپ سے بے خبر رہنے کی عادت سی پڑ گئی۔ اب اس کا مقصد سوائے اپنے ”مافیا“ کے احکامات کی تعمیل کرنے اور زندگی کی گاڑی جیسے تیسے گھیننے کے اور کچھ نہیں رہا تھا۔

○

اس روز بھی وہ اپنے کام کے سلسلے میں ہی نیویارک گیا تھا جب اچانک اس کا ماضی تمام تر دشتوں سمیت اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

ہما اکبر علی شیروانی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

خوش بختی کا پرندہ.....!

خوش قسمتی کی علامت.....!

بادشاہت بخشے والی ہما.....!

اور اپنی آگ میں جل کر بھسم ہونے والا ہما.....!

ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے موجود تھا۔

اس نے زندگی کی تمام تر واقعات کے ساتھ ہما کے قرب کو محسوس کیا جس کی گہری بادامی آنکھوں میں اسے دیکھ کر غمی اتر آئی تھی۔

خود ارسلان نے محسوس کیا تھا کہ وہ دس سال پہلے والا تھوڑا سیڑ کا طالب علم بن گیا ہے۔ یونیورسٹی کی گراؤنڈ روٹیں راستے، کلاس روم، ہوٹل کے کمرے اس کا ماضی، ایک ایک حوالہ ایک ایک سچائی ہو لے ہو لے نشتر کی طرح اس کے سینے میں اترنے لگی۔

وہ ہما اکبر علی پر سے نظریں ہٹانا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنے گالوں پر آنسوؤں کی گرمی محسوس کر کے اس نے منہ شیشے کی اس دیوار کی طرف پھیر لیا جس کے پار نیویارک کے سارے مناظر رینگ رہے تھے۔

دھند چھٹ رہی تھی لیکن اسے شیشے کی دیوار کے پار دیکھنا محال ہو رہا تھا۔

ہما اکبر علی نے اب تک تین چار مرتبہ اپنی آنکھیں پونچھی تھیں۔

لیکن.....!

وہ پتھر کا بت بنا اسے دیکھتا رہا۔

اب جو اس نے میز پر رکھے ٹشو پیپر ز کو اکٹھا کر کے اپنی آنکھوں پر جمایا تو ہما اکبر علی کے ہونٹوں پر آنسوؤں سے بھیگی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم نے رونے کی عادت کب سے ڈالی ہے؟“ اس نے ارسلان سے کہا۔

”زندگی کا ہر عمل اختیاری نہیں ہوتا ہما!“

”کاش تم نے یہ بہت پہلے جان لیا ہوتا..... کاش!“

دونوں بڑے محتاط انداز میں اپنے ماضی پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ہمانے اسے بتایا تھا کہ وہ

دو بچوں کی ماں ہے اور اس کا خاندان یہاں بزنس کرتا ہے۔ وہ اکثر یہاں کافی پینے چلی آتی ہے۔

آج بھی معمول کے مطابق آئی تھی اور اب اسے سکول سے بچوں کو لینے جانا ہے۔ اس کی گاڑی

نزدیکی پارکنگ میں موجود تھی۔

ہمانے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن وہ سب کچھ جان گئی تھی۔ دونوں پارکنگ کی

طرف جا رہے تھے۔ جب اچانک ہی ہمانے اس کی طرف دیکھا۔

”ارسلان تم میری بات تو نہیں مانو گے لیکن میں تم سے پھر التجا کروں گی کہ لوٹ جاؤ۔

ارسلان المیہ یہی ہے کہ تم بہت تیز چلتے ہو اور بہت آگے نکل جاتے ہو..... ارسلان! کوئی درخت

اپنی جڑوں سے کٹ کر نہیں جی سکتا..... تمہیں قدرتی اور مصنوعی درخت کا فرق امریکہ میں آ کر تو

ضرور معلوم ہو گیا ہوگا..... بے شناخت لوگوں کو مصنوعی درختوں کی طرح پھل نہیں لگتا۔ پھول نہیں

آتے۔ ان کی خوشبو نہیں پھیلی۔ ارسلان! میں نے بھی زندگی میں سب کچھ کھو کر یہ سب کچھ سیکھا

ہے۔ ہم مشرقی لوگ اپنی شناخت سے کٹ کر کیسے جی سکتے ہیں..... تم واپس چلے جاؤ۔ اپنے لوگوں

میں اپنی ماں کے پاس۔ میرا دل کہتا ہے وہ تمہیں ضرور معاف کر دے گی۔ یہ زمین اور ماں کا رشتہ

بہت مضبوط ہوتا ہے۔ بہت مضبوط۔ ہماری سوچ سے بھی زیادہ.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔

ارسلان خاموش رہا.....!

پارکنگ آگئی تھی۔ ہمارا اپنی کار کا دروازہ کھول رہی تھی۔

”مجھے اب جانا ہے۔ میرے بچے میرے منتظر ہوں گے۔ تمہاری ماں بھی تمہاری منتظر ہوگی..... ارسلان! اگر ماضی میں یا آج میرے اور تمہارے درمیان کوئی ذہنی رابطہ رہا ہے تو میں التجا کر رہی ہوں کہ آج میری بات نہ ٹھکرائے۔“

”ہاں ہا! میں واپس جا رہا ہوں۔ اپنی زمین کی طرف، اپنی ماں کی طرف، میں اپنے ملک میں جا کر اپنے سارے گناہوں کا اقرار کر لوں گا۔ اپنی ساری سزا پوری کروں گا..... بہت بھاگ لیا۔ تم مطمئن رہنا میں واپس چلا جاؤں گا..... میں نے کہا تھا کہ ہمارا ہر عمل اختیاری کہاں ہوتا ہے۔ ہمارے حافظ عابد نے بتایا تھا کہ خوش بختی کی یہ علامت جس کا نام ہمارے مجھے بادشاہ تو بنا دے گی لیکن میری نہیں بنے گی۔ کاش میں نے حافظ عابد کی بات سمجھ لی ہوتی..... خیر! اب تو پلیوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ گیا۔ مجھے علم نہیں کہ زندگی میں دوبارہ ہم کبھی مل پائیں گے لیکن امید ضرور ہے کہ ہم دوبارہ ملیں گے۔ تب میرا چہرہ بے شناخت نہیں ہوگا۔ تب میں اپنے تمام حوالوں کے ساتھ تمہارے سامنے آؤں گا۔ اچھا تمہارے بچے تمہارے منتظر ہوں گے۔ خدا حافظ! الوداع.....!“

اس نے سسکیاں بھرتی ہمارا کبر کی طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف موڑ کر چل دیا۔ اس مرتبہ وہ بڑے اعتماد سے قدم اٹھا رہا تھا۔ اسے آج ہی اپنے ملک کے لئے جہاز کا ٹکٹ خریدا تھا۔ اس نے اپنی شناخت تلاش کر لی تھی۔ اپنی گمشدہ جنت کا نشان پالیا تھا۔

اپنا ملک.....!

اپنی زمین.....!

اپنی ماں.....!

جہاں کے سارے منظر اس کے تھے۔

سارے حوالے اس کے تھے.....!!